MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

3

میر تقی میرؔ: فکر و فن (دوم)

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 11
میرؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ 177

اکائی 12
میرؔ کی شاعری میں علم بیان و بدیع کی صورتیں 191

اکائی 13
میرؔ کے شعری امتیازات 215

اکائی 14
میرؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 229

اکائی 15
میرؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 247

اکائی 16
میرؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 267

بلاک 3 تعارف

تیسرا بلاک ''میر تقی میؔر: فکروفن (دوم)'' کی پیشانی کے ساتھ چھ(٦) اکائیوں (اکائی نمبر١١ تا ١٦) کو محیط ہے۔ گیارہویں اکائی ''میؔر کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے مخصوص کی گئی ہے۔ جس میں میر تقی میؔر کی غزل گوئی کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر ان کی غزلوں کی خصوصیات، امتیازات، شعری اختصاصات اور قدر وقیمت کو پیش کیا گیا ہے۔ بارہویں اکائی ''میؔر کی شاعری میں علم بیان وبدیع کی صورتیں'' کے نام سے مختص کی گئی ہے، جس میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ اور صنائع لفظی ومعنوی کی روشنی میں میر کی شاعری کا مفصل اور مدلل جائزہ لیا گیا ہے۔ تیرہویں اکائی ''میؔر کے شعری امتیازات'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس اکائی میں میؔر کی تمام شعری اصناف کے حوالے سے ان کے شعری امتیازات کو واضح کیا گیا ہے۔ چودھویں، پندرھویں اور سولہویں اکائیاں خصوصی طور پر میر کی غزلوں کے متن پر مشتمل ہیں۔ ردیف 'الف، ن اور ی' کی پانچ پانچ غزلوں کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ تمام غزلوں میں کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سات اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ غزلوں کے انتخاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ میؔر کے تمام رنگ ومزاج اور اسلوب یکجا ہو جائیں۔ شامل نصاب تمام غزلوں کی عام فہم تشریح وتوضیح بھی کی گی ہے، تشریحات میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ اصطلاحی اور مشکل الفاظ کی توضیح اور شعر میں در آئے شعری محاسن کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے تا کہ طلبا با آسانی شعر سے مفہوم اخذ کرنے اور متن فہمی کا شعور اور سلیقہ اپنے اندر پیدا کر سکیں۔

اکائی 11 میرؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 میرؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

11.3.1 میرؔ کی غزل گوئی

11.3.2 ماحصل

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

11.6 سوالوں کے جواب

11.7 فرہنگ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میر تقی میرؔ کی غزلوں کے موضوع ومضامین سے واقف ہوں گے۔
- میر تقی میرؔ کی غزلوں کے فکری ابعاد وجہات سے روشناس ہوں گے۔
- میر تقی میرؔ کے شاعرانہ وسائل اور لسانی امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- میر تقی میرؔ کی غزلوں کی شعری خصوصیات سے متعارف ہوں گے۔
- میر تقی میرؔ کی غزل گوئی کے مقام ومرتبے سے واقف ہوں گے۔

10.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ نے میرؔ کی مشہور نثری کتاب ''نکات الشعرا'' کے حوالے سے ان کی ناقدانہ بصیرت اور ان کے شعری تصورات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اب آپ زیرِ نظر اکائی میں میر کی غزل گوئی کو پڑھیں گے۔ یقیناً آپ جانتے ہوں گے کہ میر نے شاعری کو اس مرتبۂ کمال تک پہنچایا کہ ''خدائے سخن'' کے لقب سے سرفراز کیے گئے۔ ایسے تو میرؔ نے اردو کی تمام تر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل گوئی ان کا خاص

میدان تھا۔ وہ حقیقتاً غزل کے بادشاہ ہیں۔ میرؔ کا کلام چھ ضخیم دیوانوں پر مشتمل ہے جس کا زیادہ تر حصہ غزلوں پر مبنی ہے۔ میرؔ کی عظمت کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری دل بیتی کے ساتھ ہی ساتھ جگ بیتی بھی ہے۔ ان کی غزلیں غنائیت اور موسیقیت سے پر ہیں۔ لہٰذا آپ اس سبق میں میر کی غزل گوئی کے تنقیدی جائزے سے مستفید ہوں گے۔

11.3 میرؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

11.3.1 میرؔ کی غزل گوئی

عالمی ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف زبانوں اور ادوار کے ادب میں شعرا کی جو تعریفیں کی گئی ہیں اور ان کے محاسن و معائب کے جو معیار مقرر کیے گئے ہیں وہ قدرے مختلف ہیں۔ لیکن ایک بات جس پر اکثر ناقدین ادب اتفاق کرتے ہیں اور اسے شاعری کی بڑی خوبی تسلیم کرتے ہیں وہ شاعری میں شاعر کے خیالات و جذبات کی سچی تصویر کشی ہے، جو براہ راست دلوں کو تسخیر کر لیتی ہے۔ اب اگر ہم اس معیار کو سامنے رکھ کر اردو شاعری کا مطالعہ کریں تو اردو کا کوئی دوسرا شاعر میرؔ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ درحقیقت میرؔ کی غزل گوئی فقط شاعری نہیں بلکہ ایک عالم کے خیالات و تجربات کا نچوڑ ہے:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

میرؔ کی شاعری میں ہم کو ان کی زندگی اور ماحول کی جیسی سچی تصویر ملتی ہے، اس کی دوسری نظیر اردو شاعری کی تاریخ میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ ان کا ایک ایک شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا اور سیدھا پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر جانے کی صفت سے متصف ہے۔ میرؔ کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی اور حکیمانہ باتوں، اہم نکات اور عالمانہ مضامین کو ایسی بے تکلفی سے پیش کر دیتے ہیں کہ بادی النظر میں قاری کو ان کی تہہ داری کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً:

ہم مذہبوں میں صرف کرم سے ہے گفتگو   مذکور ذکر یاں نہیں صوم و صلوٰۃ کا
کل پانوں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا   یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر   میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

ان کی شاعری کا دلکش لہجہ اور خیالات کا سوز و گداز ہمیں کسی کوشش یا تقلید کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا، بلکہ وہ زندگی کے تجربات و مشاہدات کا بیان محسوس ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں موجود صداقت کی وجہ سے ان کے اشعار میں ایک قسم کی دلکشی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور یہی میرؔ کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ جس کی وجہ سے انھیں غزل کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''میری رائے میں کسی شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اس کے کلام کی تاثیر ہے اور

اگر اس معیار پر میر صاحب کے کلام کو جانچا جائے تو ان کا رتبہ اردو شعرا میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہے۔ ان کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں، زبان سے نکلتے ہی دل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

(میر تقی میر از مولوی عبدالحق، مشمولہ: افکار میر، مرتبہ ایم۔حبیب خان ۱۹۹۶ء، ص:۱۲۱)

اب یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

راہ دور عشق میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

میر کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ہی ان کے لہجے کی سادگی اور بے ساختہ پن ہے۔ جسے پڑھ کر کسی بھی طرح کے تکلف یا بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ زبان و بیان پر اس قدر قدرت رکھتے ہیں کہ انھیں الفاظ کی تلاش اور شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنے کی تگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ وہ با آسانی اس سادگی سے اپنا خیال بیان کر دیتے ہیں کہ معنوی تہہ داری کے ساتھ ساتھ شعری حسن بھی دو بالا ہو جاتا ہے۔ شاعری کی خوبیوں میں سے ایک خوبی 'سہل ممتنع' ہے۔ یعنی بات کو اس طرح ادا کیا جائے کہ پہلی نظر میں تو پڑھنے والے کو یہ خیال ہو کہ یہ شعر تو بہت آسان ہے، اور ایسا شعر با آسانی کہا جا سکتا ہے۔ مگر جب عملی طور پر اس طرح کے اشعار کہنے کی کوشش کی جائے تو استاد شعرا بھی لکھنے سے قاصر نظر آئیں۔ یہ خوبی ہمیں میر کے اشعار میں سب سے بڑھ کر دکھائی دیتی ہے۔ میر کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کے مقابلے میں شعر کہنا تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ چند اشعار جن سے میر کی یہ خصوصیت نمایاں ہوتی ہے ملاحظہ کیجیے:

حالِ بد گفتنی نہیں میرا تم نے پوچھا تو مہربانی کی
سخت کافر تھا جن نے پہلے میر مذہب عشق اختیار کیا
میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

ظاہر ہے کہ شاعر کے جذبات و تخیلات ہی شاعری کا معیار نہیں ہو سکتا، بلکہ فنکاری اور شعریت بھی ایک شے ہے۔ میر اپنے خیالات کو بہتر انداز میں پیش کرنے کا ایک انوکھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کی ترسیل کے لیے جو اسلوب اپنایا ہے وہ اپنے موضوع اور مواد کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ میر کے جذبات اظہار کے انوکھے پیکر میں ڈھل کر ایک نیا رنگ اختیار کر لیتے ہے۔ ان کا کلام تصنع سے پاک، سادگی پر مبنی اور صداقت سے مزین ہے۔ میر کے یہ وہ اوصاف ہیں جو ہمیں ان کی شاعری میں آمد و برجستگی کا احساس دلاتے ہیں۔ بہ طور نمونہ یہ اشعار دیکھیے:

میرؔ سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم — ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے — اک آدھ حرف پیار کا منھ سے نکل گیا
آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز — وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے — اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ان اشعار سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ میرؔ کے یہاں اشعار کے مفہوم سے پہلے ذہن پر اس کا ایک صوتی اثر مرتب ہو جاتا ہے۔ یہ میرؔ کے مؤثر پیرایۂ بیان کا کمال ہے، وہ اپنے خیالات وجذبات کی عکاسی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا تجربہ براہ راست قاری تک پہنچ جاتا ہے۔ دیکھیے:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

وہ اپنے خیالات کو عام فہم زبان میں کچھ اس طرح انوکھے انداز میں کہہ جاتے ہیں کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان سادہ لفظوں میں ایک جہان معنی آباد ہے۔ الطاف حسین حالی اسی شعر سے متعلق یہ واقعہ کہ 'ایک روز مولانا آزردہ کے مکان پر چند احباب جن میں مومنؔ اور شیفتہؔ بھی تھے، جمع تھے، میرؔ کا یہی شعر پڑھا گیا، شعر کی نہایت تعریف ہوئی، اور طے یہ ہوا کہ ہر شخص اپنے اپنے سلیقے اور فکر کے موافق اس قافیہ کو باندھے، چنانچہ جب سبھی مصروف عمل تھے، اسی وقت ایک اور دوست آ گئے، اور مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں؟ مولانا نے کہا، قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں' بیان کرتے ہوئے میرؔ کے اس اسلوب پر لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ جوش جنوں میں گریباں یا دامن یا دونوں کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے جس کو قدیم زمانے سے لوگ برابر باندھتے چلے آئے ہیں۔ ایسے چیتھڑے ہوئے مضمون کو میرؔ نے باوجود غایت درجے کی سادگی سے ایک ایسے اچھوتے انداز اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آ سکتا۔ اس اسلوب میں بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہے، نیچرل ہے اور باوجود اس کے بالکل انوکھا ہے۔''

(مقدمہ شعر وشاعری، الطاف حسین حالی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۲۰۰۳ء، ص: ۸۲ تا ۸۳)

غزل کا اساسی موضوعات عشقیہ مضامین ہیں، جسے ہر دور کے شعرا نے برتا ہے۔ لیکن ہر عہد میں مختلف شاعروں کا تصورِ عشق مختلف النوع رہا ہے۔ بعض کے یہاں یہ تصور بے باکانہ ہے۔ بعض نے عشق کو صرف دل بہلانے کے وسیلے کے طور پر برتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اخلاقی گراوٹ اور پھکڑپن کا شکار ہو گئے ہیں۔ لیکن میرؔ کے یہاں ہمیں عشق کا جو تصور ملتا ہے، وہ نہایت بلند وعظیم، غرض سے پاک، احترام سے پر، وضعداری اور محبوب کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کے جذبے سے لبریز ہے۔ میرؔ محبوب کے حصول کو عشق کی معراج نہیں تسلیم کرتے،

بلکہ عشق میں خود کو مٹا دینے اور پھر بھی محبوب کے ظلم و ستم کا گلہ نہ کرنے کو محبت کی معراج خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک شمع و پروانہ عشق کا مثالی نمونہ ہیں، کہ پروانہ کس خاموشی سے شمع پر اپنی جان قربان کر دیتا ہے اور خود جل کر خاک ہو جاتا ہے، مگر اف نہیں کرتا۔ میرؔ کے عشقیہ اشعار میں ایک قسم کی عظمت کا احساس پایا ہے۔ بطور مثال یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے　　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ　　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر　　　ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

میرؔ کے یہاں اسی تصور کے باعث محبوب کے حسن اور اس کے سراپا کی جو تصویریں ابھر کر سامنے آتی ہیں ان کی دلکشی معصومیت کی حامل اور پاکیزگی اور سنجیدگی سے مزیّن ہوتی ہے۔ میرؔ کبھی جزوی طور پر محبوب کے اعضاے جسمانی کی خوبصورتی کا بیان نہیں کرتے، بلکہ ایسے الفاظ کا انتخاب اور تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں، جس سے ایک کامل حسین شخصیت تشکیل پاتی ہے، گویا ان کی نظر جز کے بجائے کل پر رہتی ہے۔ میرؔ کا محبوب سراپا خیال نہیں بلکہ جسم اور رنگ و بو کا ایک حسین پیکر ہے۔ البتہ مادی کثافتوں سے پاک ہے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

بر قعہ اٹھتے ہی چاند سا نکلا　　　داغ ہوں اس کی بے حجابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　　اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا　　　چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

میرؔ کا تصورِ عشق تکریم و تعظیم کی حرمت سے معمور ہے۔ ہر چند کہ اس کا انجام عموماً باعثِ رنج و ملال ہوتا ہے۔ جس میں تنہائی، اجنبیت، کم مائیگی اور دل کی بربادی و ویرانی کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن　　　سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

میرؔ کے ناقد اس بات پر متفق ہیں کہ میرؔ کا مفہوم عشق بہت وسیع ہے۔ وہ پوری کائنات کو عشق کا مظہر سمجھتے ہیں:

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے　　　اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

تصوفانہ مضامین کی فارسی غزل میں ایک مستحکم روایت رہی ہے۔ اردو میں بھی فارسی کے زیر اثر یہ روایت چلی آ رہی ہے۔ حالاں کہ عموماً شعرا نے صوفیانہ خیالات کو رسمی طور پر برتا ہے۔ لیکن اردو کے بعض شاعر ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے تصوف کے موضوع کو نہ صرف برتا بلکہ انھیں واقعتاً تصوف سے لگاؤ تھا اور وہ متصوفانہ خیالات کے حامی اور پیرو تھے۔ میرؔ کا ذکر بھی اسی قبیل کے شعرا میں ہوتا ہے۔ گویا تصوف کا تجربہ ان کے یہاں

روایتی نہیں ہے:

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گذری
ہر شام نئی ایک مصیبت گذری

دراصل ان کے یہ متصوفانہ خیالات موروثی تھے۔توکّل،قناعت اور عشق ان کو خاندانی ورثہ میں ملا تھا۔ان کے یہاں انسان کی عظمت و بلندی کا جو تصور ہے وہ بھی تصوف سے ہی مستعار ہے۔ بندۂ خاکی ہر چند کہ ایک کمزور اور ناپائدار ہستی ہے لیکن اسے اشرف المخلوقات کا شرف حاصل ہے۔لہٰذا کائنات میں اس کی عظمت مسلّم ہے۔اسی خیال نے میرؔ کی شاعری میں انسان دوستی اور وسیع النظری کے مضامین کو راہ دی۔میرؔ کا ماننا ہے کہ خدا سے محبت کی دلیل یہ ہے کہ اس کی تمام مخلوق سے محبت کی جائے،یہی وجہ کہ میرؔ کی غزلوں میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں نمایاں ہیں۔اوران کی شاعری میں ہر دو قسم کے خیالات کثرت سے ملتے ہیں۔بطور نمونہ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

آدم خاکی سے آدم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ ولے قابل دیدار نہ تھا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

دو بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو، یہ بستی اُجاڑ کے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

اسی طرح یاس انگیز اشعار کی روشنی میں میرؔ کو اُجڑی ہوئی دلّی کی علامت کہا گیا ہے۔شاعری اپنے عہد کا آئینہ ہوتی ہے۔میرؔ کی شاعری میں یہ خصوصیت دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہے کہ ان کی شاعری کو' دل اور دلی کا مرثیہ' کہا گیا ہے۔گویا میرؔ نے اپنے عہد کے حالات کو غزلیات کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج وتخت کا

دلّی میں اب کے آکر ان یاروں کو نہ دیکھا
کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے

تو ہے بے چارہ گدا میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی　　مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو

بچپن کی تعلیمات، زندگی بھر کے ناساز گار حالات اور زندگی کی ناکامیوں نے میرؔ کو تنہائی پسند، دنیا کی بے ثباتی کا محرم اور عشق میں مٹ جانے کا آرزومند بنا دیا تھا۔ یہ خیالات ہم کو میرؔ کی شاعری میں جا بجا ملتے ہیں۔ اس ضمن میں میرؔ کا یہ شعر حقیقت کی عکاسی کرتا ہے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے　　درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

لیکن میرؔ نے آزمائشوں سے راہِ فرار اختیار کرنے کے بجائے غموں سے نباہ کا پیغام دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو　　ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

یاد رہے کہ غم و گداز شاعری کے لیے کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے جس شاعری میں غم و الم کا بیان ہوتا ہے وہ پڑھنے والوں کے دلوں پر براہ راست اثر کرتی ہے، شرط یہ ہے کہ وہ عظمت اور پاکیزگی سے مزیّن ہو۔ انگریزی کا مشہور شاعر کیٹس کہتا ہے کہ ''ہمارے دلکش ترین نغمے وہ ہیں جو درد آفریں ہوں۔'' اب آپ میرؔ کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں　　سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا

میرؔ اپنے غم کو آفاقی بنا کر پیش کرتے ہیں:

مرے رونے کی حقیقت جس میں تھی　　ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات　　اب یہی روزگار ہے اپنا
ہمیشہ آنکھ ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے　　خدا کسی کو مجھ سا درد مند نہ کرے

یہ درست ہے کہ میرؔ کا زندگی سے متعلق تصور اور نقطۂ نظر حزنیہ ہے جس میں تخیل و تفکر کو دخل ہے:

ہر صبح غموں میں شام کی ہے میں نے　　خونابہ کشی مدام کی ہے میں نے
یہ مہلت کم جس کو کہتے ہیں عمر　　مر مر کے غرض تمام کی ہے میں نے

لیکن یاد رہے کہ میرؔ قنوطی شاعر نہیں ہیں۔ میرؔ کا تصورِ زندگی کسی صورت مایوس کن نہیں، ہاں البتہ اس میں غم و الم کا ذکر نمایاں ہے۔ لیکن میرؔ کا غم و الم ہمیں مایوسی کے بجائے حوصلہ عطا کرتا ہے۔ کیوں کہ اس میں زندگی کی بھرپور توانائی موجود ہے۔ میرؔ کا تصورِ غم ان کی شاعری میں سنجیدگی، توازن اور ٹھہراؤ کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ بلکہ ضبط، وتحمل کا درس دیتا ہے۔ وہ اپنی ذہنی، جذباتی اور فکری نشو و نما کے اسباب کی روشنی میں زندگی کو ایک مخصوص نقطۂ نظر

سے دیکھتے ہیں، جس میں زندگی کی بے ثباتی اور فنا کا احساس غالب ہے۔ اور انہیں اسباب وعلل نے میرؔ کی غزل کو زندگی سے قریب بھی کر دیا ہے۔ اسی باعث ان کے اشعار میں صداقت اور خلوص ایک آفاقی صورت اختیار کر لیتی ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا
بے رنگ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا — بلبل نے کیا سمجھ کر یاں آشیاں بنایا

مجنوں گورکھپوری ان کے تصورات غم سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''میرؔ کے کلام کے مطالعہ سے ہمارے جذبات وخیالات اور ہمارے احساسات ونظریات میں وہ ضبط اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے، جس کو صحیح معنوں میں تحمل کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ تحمل نہیں جو مستی اور مجہولیت کا دوسرا نام ہے۔ یہ وہ تحمل ہے جو انسان کی فکری اور عملی قوت میں توازن اور تمکنت اور مزید توانائی پیدا کرتا ہے۔.....میرؔ نے غم عشق اور غم زندگی دونوں کو زندہ رہنے اور مقابلہ کرنے کے تازہ دم حوصلہ میں تبدیل کر دیا۔ وہ درد کو ایک سرور اور الم کو ایک نشاط بنا دیتے ہیں۔.....میرؔ کو محض غم دوست یا قنوطی سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی شاعری کا صرف سطحی مطالعہ کیا گیا ہے۔''

(میرؔ اور ہم، مجنوں گورکھپوری، مشمولہ افکار میرؔ، مرتبہ ایم حبیب خان، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۹۷)

میرؔ نے اپنی غزلوں میں فکر وفن کا ایک نیا جہاں تعمیر کیا ہے۔ ہم میرؔ کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میرؔ کی شخصیت اور سخن گوئی دونوں ہمہ گیر اور قابل رشک ہیں۔ اپنے معاصرین کی شخصیت پر چھا جانے والے میرؔ کے شاعرانہ تعلّی پر مبنی اشعار شاہد ہیں کہ خود میرؔ کو اپنے کمال فن کی بلندی سے پوری طرح واقفیت تھی:

سب دیے ہیں میرؔ کو جگہ اپنی آنکھوں پہ — اس خاک رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو
اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض — اول تو میں سند ہوں پھر یہ میری زباں ہے
جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز — تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا

فراقؔ گورکھپوری نے میرؔ کے یہ اشعار:

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے — کچھ بات ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں
ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا — پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میر نے جو باتیں مندرجہ بالا تین اشعار میں اپنی شاعری کے متعلق کہی ہیں اتنی صداقت کے ساتھ غالب، آتش، انیس اور اقبال اردو کے بڑے سے بڑے شعرا اپنے متعلق یہ باتیں نہیں کہہ سکتے تھے، کیوں کہ ان دوسرے شاعروں کے کارنامے دوسرے محاسن کے حامل ہیں۔ ان مخصوص محاسن کے حامل نہیں ہیں، جنھیں مدنظر رکھ کر میر نے یہ دعویٰ کیا ہے۔''

(میر کی عالم گیر مقبولیت، مشمولہ افکار میر، ص:۱۶۰)

یاد رہے غالب کی طرح میر کا بھی اختصاص یہ ہے کہ ان کے کلام میں ان کے دعووں کے دلائل بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ میر فطری شاعر ہیں اور ان کو فطری شاعر کہنا، مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے۔ فطری شاعری دراصل ایک معجزہ ہے۔ کلامِ میر کی سحر انگیزی یہ ہے کہ وہ ہمارے دل میں نمو پزیر احساسات اور جذبات کی اتنی فطری مصوری روزمرہ اور سادہ الفاظ میں کر دیتے ہیں کہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ گویا میر اپنی غزلوں میں زیادہ تر روزمرہ کے تجربات کو عام انسانی تجربات کی سطح پر لا کر بیان کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میر اردو شاعری کے نہایت بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہر دور میں خاص و عام نے اپنے لیے باعث فخر سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے ہر دور کے صاحب کمال شعرا نے انھیں بغیر کسی پس و پیش کے اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ درج ذیل میں بعض استاد شعرا کے اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعوی　　پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میر کے منہ پر　　(مصحفی)

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں　　(ناسخ)

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب　　ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا　　(ذوق)

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ　　'آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں'　　(غالب)

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا　　(غالب)

میر کا رنگ برتنا نہیں آساں اے داغ　　اپنے دیوان سے ملا دیکھیے دیوان ان کا　　(داغ)

شعر میرے ہیں پر درد ولیکن حسرت　　میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں　　(حسرت)

یوں تو ہیں مجروح شاعر سب فصیح　　میر کی پر خوش بیانی اور ہے　　(مجروح)

اک بات بتاؤ انشا جی تمھیں ریختہ کہتے عمر ہوئی

تم سارے جہاں کا علم پڑھے کوئی میر سا شعر کہا تم نے　　(ابن انشاء)

اور تو اور میر کے معاصر سودا جو کہتے ہیں 'اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے' منھ میں زباں رکھنے کا دعوی نہ کرے، مگر غزل گوئی میں وہ بھی میر کی استادی کا اعتراف کرتے ہیں:

استاد کی طرف ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے سوداؔ تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ

دراصل میرؔ نے مظاہر کائنات سے تجربات ومشاہدات کا عطر کشید کر ان پر اپنی تخلیقی قوتوں کی ایسی چھاپ لگا دی ہے جس کی نظیر پوری اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے شعرا حسب موقع یا اپنی بساط بھر میرؔ کی مشعل سے اپنے چراغوں کو روشن کرتے رہے ہیں۔ میرؔ کا دور اردو شاعری کا سنہری دور تسلیم کیا جاتا ہے اور میرؔ کو خدائے سخن:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا ! سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

یہاں بات یہ نہیں کہ غزل کی دنیا میں کوئی میرؔ کے مقام تک نہیں پہنچ سکا، حیرت یہ ہے کہ کسی نے میرؔ کی ہمسری کا دعوی ہی نہیں کیا، غالب نے بھی نہیں، بلکہ میرؔ کی عظمت کے وہ بھی قائل رہے۔ میرؔ اردو غزل کے سب سے بڑے استاد شاعر ہیں۔ ہر عہد میں متاخرین نے میرؔ سے کسب فیض کیا ہے۔ غزل میں ان کا ہم رتبہ کوئی نہیں ہو سکا۔ میرؔ کے مرتبۂ کمال نے انھیں غزلوں کا امام بنا دیا۔ حالاں کہ غالب بھی اردو کے بڑے شاعر ہیں اور بعض ناقدین تو انھیں میرؔ سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے میرؔ و غالبؔ دونوں ہی اپنے فن میں یکتا ہیں۔ میرؔ کے مکمل کلام کی سنجیدگی سے تعبیر وتفہیم کے بغیر کوئی حتمی رائے قائم کر لینا ادبی بد دیانتی ہوگی، البتہ منطقی استدلال کے باعث بعض معاملات میں ایک کو دوسرے پر جزوی فوقیت دی جا سکتی ہے، میر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے روزمرہ کی زبان کو شاعری بنا دیا، جب کہ غالبؔ کے یہاں معنوی ابعاد اور فکری جہتیں زیادہ ہیں۔ میرؔ کے یہاں انسانی تعلقات، پراگندہ معالات کی اور غالبؔ کے یہاں تحیر وتعقل کی بوقلمونی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کا محاکمہ نہایت معتدل ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''...زبان کے تنوع، تجربہ حیات کی کثرت اور شخصیت کی ہمہ گیری میں میرؔ کا مرتبہ غالب سے اعلیٰ ہے۔ خالص تعقل اور تجرید اور نازک خیالی میں غالب کا درجہ میرؔ سے بلند ہے۔ دونوں کے تخیل میں فرق ہے، لیکن تخیل کی شدت دونوں کے یہاں برابر ہے۔ یعنی دونوں بے حد مضمون آفریں ہیں۔ غالب کا تخیل آسمانی ہے اور میرؔ کا تخیل زمینی یعنی غالب تجریدی (abstract) زیادہ ہیں اور میرؔ ٹھوس اور مرئی (concrete) زیادہ ہیں۔ معنی آفرینی میں دونوں برابر ہیں۔ ہاں ایک صفت کیفیت کی میرؔ کے یہاں ایسی ہے جو غالب کے یہاں بہت کم ہے۔ میرؔ کا کمال یہ بھی ہے کہ معنی آفرینی کے ساتھ کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ شور انگیز اشعار دونوں کے یہاں کثرت سے ہیں رعایت لفظی سے دونوں کو بے حد شغف ہے۔''

(شعر شور انگیز، جلد اول (خدائے سخن میرؔ کہ غالب) شمس الرحمٰن فاروقی، ۲۰۰۶ء، ص: ۴۱)

مختصر یہ کہ میرؔ کی غزل متنوع افکار ومسائل کی ترجمان اور ذات وکائنات کی تعبیر وتفہیم کا اشاریہ ہے۔ دراصل میرؔ کی غزل گوئی کا فکری اور معنوی کینوس اس قدر وسیع ہے کہ اس کی ہمہ گیری کو کسی ایک اصطلاح کے خانے میں

مقید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے جذبوں کی وجدانی کیفیت کو اپنی تخلیقی قوت سے متنوع جہات میں اس طرح لفظوں کو آسان اور روزمرّہ کو شاعری بنا کر سمو دیتے ہیں کہ ان کی معنویت غزل کو جمالیاتی صداقت کا ایک نیا کثیر المعنی احساس عطا کرتی ہے۔ نتیجے میں ان کی غزل انفرادیت کے عناصر کی ایک نا قابل تسخیر تخلیق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے باب میں میؔر کے اتباع کی کوشش معاصرین ومتاخرین دونوں کرتے رہے ہیں، مگر ہر دور میں ثابت یہ ہوا کہ میؔر کے اسلوب کی تقلید آسان نہیں ہے۔

11.3.2 ماحصل

میؔر کی غزلیں پوری اردو شاعری کا شناخت نامہ ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی جو تصویر غزل کے ذریعے پیش کی ہے، اسے غزل کے استعاراتی اور علامتی اظہار نے آفاقی بنا دیا ہے۔ میؔر کی غزلوں کا مطالعہ کرنے پر عشق کی محرومی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح زندگی کی بے کسی بھی ان کے یہاں بنیادی موضوع کی شکل میں اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ غزلوں میں اندازِ بیان کی سادگی بہ طور پر خاص متاثر کرتی ہے۔ مشکل سے مشکل خیالات کو وہ انتہائی فطری انداز میں پیش کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ احساس کی شگفتگی ان کی غزلوں کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ ان کے اشعار بہ ظاہر سادہ اور آسان سے معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت ان میں زندگی کے گہرے اور پیچیدہ مسائل پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ مترنم بحروں کا استعمال کرتے ہیں جن سے غزل میں غضب کی نغمگی اور موسیقی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک اور وصف ان کا داخلی عناصر اور سوز و گداز ہے، وہ انہیں کیفیات کو پیش کرتے ہیں جو ان کے تجربے اور مشاہدے کا حصہ ہوتی ہیں۔ اسی لیے مسلسل ایک نوع کا فطری آہنگ ان کی غزلوں میں پایا جاتا ہے، جس کا اثر براہ راست دل پر ہوتا ہے۔ میر کی غزلوں کا خطابیہ انداز احساس کا ایک ایسا اجتماعی رنگ پیش کرتا ہے جو ذات اور فرد سے بالاتر نظر آتا ہے اور یہ میر کا اختصاصی پہلو ہے۔ میؔر کی غزلوں میں خطابیہ اور بیانیہ پیش کش کا ایک حسین امتزاج ہے۔ میؔر نے اپنی غزلوں میں اشاریت اور ایمائیت کے ذریعے مخصوص تاثرات و واقعات کو کچھ اس طرح نظم کیا ہے کہ ان سے آفاقی صداقتوں کا احساس ہوتا ہے۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میؔر کے سہل ممتنع سے واقفیت حاصل کی۔
- میؔر کی عشقیہ شاعری کے امتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- میؔر کی صوفیانہ شاعری کا ادراک کیا۔

- میرؔ کے فکری، فنی اور لسانی اوصاف کو جاننا۔
- میرؔ کی غزلوں کے مقام و مرتبہ کو پہچاننا۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میر کی غزل گوئی کے پانچ اختصاص بیان کیجیے۔

۲۔ میرؔ و غالبؔ کی تقابلی عظمت کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا موقف بیان کیجیے۔

۳۔ مجنوں گورکھپوری نے میرؔ کے تصورات غم سے متعلق کیا کہا ہے؟ تحریر کیجیے۔

۴۔ خدائے سخن کس شاعر کو کہا جاتا ہے اور ان کا کلام کتنے دیوان پر مشتمل ہے؟ واضح کیجیے۔

۵۔ یاس انگیز اشعار کی روشنی میں میر کو کیا کہا گیا ہے؟ بیان کیجیے۔

11.6 سوالوں کے جواب

۱۔ میر کی غزل گوئی کا اختصاص یہ کہ ان کی غزلیں تاثیر اور نغمگی کے باعث دلوں میں اتر جانے کی صفت سے متصف ہیں۔ دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی اور حکیمانہ باتوں، اہم نکات اور عالمانہ مضامین کو ایسی بے تکلفی سے پیش کر دیتے ہیں کہ بادی النظر میں قاری کو ان کی تہہ داری کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ان کی غزلوں کا تیسرا خاصہ دلکش لہجہ اور خیالات کا سوز و گداز زندگی کے تجربات و مشاہدات کا عکس ہے۔ چوتھی خوبی میرؔ کی انسان دوستی اور وسیع النظری ہے۔ ان کی غزلوں کی پانچویں خوبی عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کا باہمی امتزاج ہے۔

۲۔ میر و غالب کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا موقف یہ ہے کہ:

> ’’...زبان کے تنوع، تجربہ حیات کی کثرت اور شخصیت کی ہمہ گیری میں میرؔ کا مرتبہ غالب سے اعلیٰ ہے۔ خالص تعقل اور تجرید اور نازک خیالی میں غالب کا درجہ میرؔ سے بلند ہے۔ دونوں کے تخیل میں فرق ہے، لیکن تخیل کی شدت دونوں کے یہاں برابر ہے۔ یعنی دونوں بے حد مضمون آفریں ہیں۔ غالب کا تخیل آسمانی ہے اور میرؔ کا تخیل زمینی یعنی غالب تجریدی (abstract) زیادہ ہیں اور میرؔ ٹھوس اور مرئی (concrete) زیادہ ہیں۔ معنی آفرینی میں دونوں برابر ہیں۔ ہاں ایک صفت کیفیت کی میرؔ کے یہاں ایسی ہے جو غالب کے یہاں بہت کم ہے۔ میرؔ کا کمال یہ بھی ہے کہ معنی آفرینی کے ساتھ کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ شور انگیز اشعار دونوں کے یہاں کثرت سے ہیں رعایت لفظی سے دونوں کو بے حد شغف ہے۔‘‘

۳۔ مجنوں گورکھپوری نے میر کے تصورات غم کے متعلق لکھا ہے کہ:

''میرؔ کے کلام کے مطالعہ سے ہمارے جذبات وخیالات اور ہمارے احساسات و نظریات میں وہ ضبط اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے، جس کو صحیح معنوں میں تحمل کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ تحمل نہیں جو مستی اور مجہولیت کا دوسرا نام ہے۔ یہ وہ تحمل ہے جو انسان کی فکری اور عملی قوت میں توازن اور تمکنت اور مزید توانائی پیدا کرتا ہے۔..... میرؔ نے غم عشق اور غم زندگی دونوں کو زندہ رہنے اور مقابلہ کرنے کے تازہ دم حوصلہ میں تبدیل کر دیا۔ وہ درد کو ایک سرور اور الم کو ایک نشاط بنا دیتے ہیں۔..... میرؔ کو محض غم دوست یا قنوطی سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی شاعری کا صرف سطحی مطالعہ کیا گیا ہے۔''

۴۔ اردو کے عظیم شاعر میر تقی میرؔ کو خدائے سخن کہا جاتا۔ ان کا کلام چھ ضخیم دیوانوں پر مشتمل ہے جس کا زیادہ تر حصہ غزلوں پر مبنی ہے۔

۵۔ یاس انگیز اشعار کی روشنی میں میرؔ کو اُجڑی ہوئی دلّی کی علامت کہا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں یہ خصوصیت دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہے کہ ان کی شاعری کو 'دل اور دلی کا مرثیہ' کہا گیا ہے، کیوں کہ میر نے اپنے عہد کے حالات کو غزلیات کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

11.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
غنائیت	:	ترنم، نغمگی، موسیقیت
خطیبانہ	:	تقریر والا انداز
روزمرّہ	:	عام بات چیت کا اسلوب جو اہل زبان کے طریق استعمال کے مطابق ہو
تسخیر	:	قابو میں لانا، تابع کرنا، دل لبھانا، مائل کرنا
دست طمع	:	دست بہ معنی ہاتھ، طمع بہ معنی خواہش، امید و توقع
مبتذل	:	معمولی، حقیر، گیا گزرا
توکّل	:	اللہ پر بھروسہ، قناعت
شتابی	:	عجلت، جلدی، تیزی
یاس انگیز	:	مایوسی کی حالت، ناامیدی کی صورت
مرئی	:	جو دیکھنے میں آئے یا وہ جسے دیکھ سکیں
قنوطیت	:	مایوسی، ناامیدی
تمکنت	:	غرور، نخوت، وقار، دبدبہ

11.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	شعر شور انگیز (جلد اول)	:	شمس الرحمٰن فاروقی
۲۔	نقدِ میر	:	سید عبداللہ
۳۔	میر کی شعری لسانیات	:	قاضی افضال حسین
۴۔	میر کی غزل گوئی ایک جائزہ	:	راشد آزر
۵۔	افکار میر	:	مرتبہ ایم حبیب خاں

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اکائی 12 میر تقی میرؔ کی شاعری میں علم بیان و بدیع کی صورتیں

ساخت

12.1 اغراض و مقاصد

12.2 تمہید

12.3 میر تقی میرؔ کی شاعری میں علم بیان و بدیع کی صورتیں

12.3.1 علم بیان

12.3.2 علم بدیع

12.3.3 ماحصل

12.4 آپ نے کیا سیکھا

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

12.6 سوالوں کے جوابات

12.7 فرہنگ

12.8 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میرؔ کی شاعری میں موجود شعری محاسن کے مختلف ذرائع سے واقف ہوں گے۔
- علم بیان کی تعریف اور اس کے اجزا سے متعارف ہوں گے۔
- تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کے حوالے سے کلامِ میرؔ کو سمجھیں گے۔
- علم بدیع کی اقسام اور اس کے ذیل میں آنے والی صنعتوں سے آگہی حاصل کریں گے۔
- صنائع لفظی و معنوی کی روشنی میں میرؔ کی شاعری کے امتیازات سے واقف ہوں گے۔

12.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میر کی غزل گوئی کے امتیازات، خصوصیات اور معنویت کو تفصیل سے پڑھا۔ اب آپ زیرِ نظر اکائی میں میر کی شاعری کے ان اوصاف سے متعارف ہوں گے جن کا تعلق علم بیان اور علم بدیع سے ہے۔ علم بیان و بدیع کلام کی وہ طاقت ہے جس کی مدد سے شاعر اپنے کلام میں حسن بیان، معنی آفرینی،

مضمون آفرینی، اختراعی قوت، تہداری اور مضامین میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ یعنی شاعر اپنے کلام کو مذکورہ وسائل کے ذریعے آراستہ کردیتا ہے۔ اردو شاعری کی تنقید میں قدما سے لے کر موجودہ زمانے کے ناقدین تک بیشتر اس بات پر متفق ہیں کہ مضمون کے مقابلے میں اسلوب بیان کی جدت یہ طے کرتی ہے کہ کون سا شاعر کامیاب ہے اور کون ناکامیاب۔ اس لیے کہ مضمون تو سبھی شاعروں کے لیے یکساں طور پر موجود ہوتا ہے۔ شاعر کی انفرادیت اور بڑائی مضمون کی فن کارانہ پیشکش میں ہے۔ گویا زبان اور اظہار کے طریقوں پر قدرت ہی کسی شاعر یا تخلیق کار کی کامیابی اور بڑائی کی ضمانت ہے۔ میر کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے والوں نے ثابت کیا ہے کہ میر کے کلام میں کوئی شعر طرز بیان کی جدت اور صناعی سے خالی نہیں ہے۔ عزیز طلبا! لہٰذا آپ اس سبق میں میر کے کلام میں موجود بیان و بدیع کی خوبیوں کو تجزیے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

12.3 میر تقی میرؔ کی شاعری میں علم بیان و بدیع کی صورتیں

12.3.1 علم بیان

علم بیان اظہار کے ان طریقوں اور قاعدوں کا علم ہے جس کے جاننے کے بعد ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ کسی بات، خیال یا معنی کو مختلف انداز میں کس طرح لکھا یا ادا کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ ایک انداز بیان، معنی و خیال کو، دوسرے انداز بیان کے مقابلے میں کس طرح زیادہ واضح کرتا ہے۔ علم بیان کے مقصود پر ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

> ”علم بیان ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی بات کو کس طرح مختلف طریقوں سے بیان کیا جائے کہ ایک معنی دوسرے سے زیادہ واضح اور دل کش ہوں یعنی ایک ہی معنی پر دلالت کرنے کے لیے مختلف طریقے کس طرح استعمال کیے جائیں...... کسی بات یا خیال کو مختلف پیرایوں میں اس طرح بیان کرنا جس سے اس کی ترسیل کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور اس میں لطف و تاثیر کے علاوہ جدت اور ایجاز بھی پیدا ہو علم بیان کے ذیل میں آتا ہے۔“

(درسِ بلاغت، ۲۰۱۹، ص:۱۸)

مولوی نجم الغنی ”بحر الفصاحت“ میں لکھتے ہیں:

> ”علم بیان ایسے قاعدوں کا نام ہے کہ اگر کوئی ان کو جانے اور یاد رکھے تو ایک معنی کو کئی طریق سے عبارات مختلفہ میں ادا کرسکتا ہے جن میں سے بعض طریق کی دلالت معنی پر بعض طریق سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔“

(بحر الفصاحت، ص:۶۶۲)

مولوی نجم الغنی نے مختلف جملوں کے ذریعے، ایک ہی خیال یا معنی کی ادائیگی کی مثالیں بھی اپنی کتاب میں پیش کی ہیں۔اس سے علم بیان کی تعریف اوراس کے مقصد کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔لکھتے ہیں:

''وصف سخاوت کے لیے کئی لوازم ہیں جن میں بعض کی دلالت سخاوت پر زیادہ واضح ہے اور بعض کی دلالت اس پر کم واضح ہے چنانچہ کہیں، زید کے یہاں مہمان آتے ہیں، یا زید کے باورچی خانے سے راکھ زیادہ نکلتی ہے، یا زید کے یہاں گھی اور دوسری کھانے کی چیزیں زیادہ خرچ ہوتی ہیں، یا زید رضائیاں بہت تقسیم کرتا ہے، یا زید کے مہمان اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں، یا زید نے راستوں میں بہت سے کنویں اور مسجدیں بنوائی ہیں، پس ان میں بعض لوازم کی دلالت سخاوت پر واضح ہے اور بعض کی خفی ہے۔''

(بحر الفصاحت ،ص:٦٦٦)

یہاں سخاوت کے مفہوم کو مختلف انداز میں بالواسطہ طریقے سے ادا کیا گیا ہے۔ان جملوں میں براہ راست زید کو سخی کہنے کے بجائے اُس کی سخاوت کو ثابت کرنے والی چیزوں یا کاموں کا ذکر کیا گیا ہے۔اس میں ایک انداز بیان دوسرے سے مختلف ہے اور معنی کی وضاحت کی سطح بھی الگ الگ ہے۔معنی یا خیال کی ادائیگی کا یہ ایک رنگ ہے۔

اظہارِ معنی کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس کے اصل معنی کی جگہ کسی دوسرے معنی میں استعمال کیا جائے لیکن اس طرح کہ لفظ کے اصل معنی اور مطلوبہ معنی کے درمیان کوئی رشتہ موجود ہو۔مثال کے طور پر کسی شخص کو کہا جائے کہ ''وہ شیر ہے'' تو ظاہر ہے یہاں لفظ 'شیر' سے مراد کوئی 'درندہ جانور' نہیں بلکہ ایک شخص ہے۔یعنی یہاں 'شیر' کا لفظ اپنے اصل معنی کے بجائے ایک دوسرے معنی میں استعمال کیا گیا ہے لیکن اس طرح کہ اصل معنی اور مطلوبہ معنی کے درمیان تعلق موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ شیر کی صفات (بہادری، بے خوفی وغیرہ) کو مذکورہ شخص کے لیے ثابت کیا گیا ہے۔

میر تقی میر کے حسنِ بیان اور طرفگیِ اظہار میں یہ سب باتیں شامل ہیں اور اسی سے میر کے اسلوب کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔میر کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ شروع کرنے اور اس میں بیان و بدیع کی صورتیں تلاش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ لفظ و معنی کی حیثیت اور علم بیان کے اجزا سے ہماری واقفیت ہو تبھی اس عمل کو ہم صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

ہر لفظ کسی مخصوص معنی کے لیے بنایا گیا ہے۔جب کسی لفظ کو بولنے یا لکھنے میں وہی معنی مراد ہوں جس کے لیے وہ لفظ بنا ہے تو اسے ''حقیقی معنی'' کہتے ہیں۔لیکن اگر لفظ سے کوئی اور معنی مراد لیے جائیں اور وہ معنی جس کے لیے

لفظ بنایا گیا ہے مراد نہ ہوں، تو اسے ''مجازی معنی'' کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ جب اپنے لغوی معنی میں استعمال ہو تو 'حقیقت' ہے اور جب لغت میں دیے گئے معنی کے بجائے کسی اور معنی میں استعمال ہو، تو اسے 'مجاز' کہتے ہیں۔

علم بیان کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:

(۱) تشبیہ (۲) استعارہ (۳) مجاز مرسل (۴) کنایہ

تشبیہ کا مجاز کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کہ تشبیہ میں لفظ ہمیشہ حقیقی معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ علمائے بلاغت نے اسی لیے تشبیہ کو مجاز کی صورتوں (استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ) میں شامل نہیں کیا ہے۔ 'استعارہ' جو کہ مجاز کی ایک قسم ہے، بنیادی طور پر تشبیہ پر منحصر ہے۔ اس لیے تشبیہ کو بھی علم بیان میں شامل کیا گیا کہ اس کے بغیر ہم استعارہ کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

(۱) تشبیہ:

تشبیہ کے معنی ہیں باہم مشابہ ہونا۔ یعنی جب دو مختلف چیزوں کو کسی صفت یا خصوصیت کی وجہ سے ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیا جائے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔

کلام میں تشبیہ کے استعمال کا مقصد عموماً صورت حال، کیفیت، خیال یا شے کی وضاحت کرنا ہوتا ہے۔ کبھی شاعر اسے مشبہ کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے اور کبھی مشبہ کی صفات بیان کرنے کے لیے لاتا ہے۔

تشبیہ کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں:

- مشبہ : جس چیز کو مشابہ قرار دیا جائے۔
- مشبہ بہ : جس چیز کے مشابہ بتایا جائے۔
- طرفین تشبیہ : مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مل کر طرفین تشبیہ کہلاتے ہیں۔
- وجہ شبہ/ وجہ تشبیہ : وہ مشترک صفت جس کی بنیاد پر ایک کو دوسرے کی مانند بتایا جائے۔
- ادوات تشبیہ : وہ الفاظ جو ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دینے کے لیے لائے جاتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ شعر میں تشبیہ کے مذکورہ تمام اجزا کا ذکر ہو۔ بس مشبہ اور مشبہ بہ کا ہونا ضروری ہے۔

عزیز طلبا! آیئے میرؔ کے ایک شعر کے ذریعے مذکورہ باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس میں 'لب' کو 'گلاب کی پنکھڑی' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ لب 'مشبہ' ہے اور گلاب کی پنکھڑی 'مشبہ بہ' ہے۔ 'نازکی' کو شاعر نے گلاب (مشبہ بہ) کی صفت بتایا ہے اور اسے لب (مشبہ) کے لیے ثابت کیا ہے، اس لیے نازکی 'وجہ

شبہ' یا وجہ تشبیہ ہوئی۔ پھر لب اور گلاب کی پنکھڑی یعنی 'طرفین تشبیہ' کو صفت میں مشترک بتانے کے لیے' کی سی' کے الفاظ لائے گئے ہیں جنھیں 'ادوات تشبیہ' کہا جاتا ہے۔ اس طرح میرؔ نے اس شعر میں تشبیہ کے سبھی ارکان جمع کر دیے ہیں۔

علمائے بلاغت نے حسّی اور عقلی بنیادوں پر تشبیہ کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں جن کی تفصیل ''درس بلاغت'' اور ''بحرالفصاحت'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں صرف اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ تشبیہ دو چیزوں کے درمیان قائم ہوتی ہے خواہ وہ حسّی ہوں یا عقلی۔ مشبہ اور مشبہ بہ کے علاوہ شعر میں تشبیہ کے دوسرے اجزا موجود نہ بھی ہوں تب بھی تشبیہ قائم ہوگی۔

تشبیہ مجاز کی قسم نہ سہی لیکن معنی و خیال کی پیش کش کا ایک مؤثر بالواسطہ ذریعۂ اظہار ہے۔ میرؔ نے تشبیہات کو معنی و خیال کی وضاحت اور ترسیل کے لیے کس خوبی سے استعمال کیا ہے اور اس سے ان کے اسلوب میں جو نیرنگی پیدا ہوتی ہے، اُسے درج ذیل مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا　　　　سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمیں

اس شعر میں دل کو 'سرزمیں' سے اور خواہش کو 'تخم' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شعر کا بنیادی موضوع 'خواہشات کی عدم تکمیل' ہے۔ لیکن اسے بیان کرنے کے لیے میرؔ نے 'دل' اور اس میں پیدا ہونے والی 'خواہش' کو 'کھیت' اور اس میں کاشت کیے جانے والے 'تخم' کے خیال/عمل کے مشابہ بتایا ہے۔ دل کی سرزمین کے بنجر پن کی وجہ سے خواہش کی تخم ریزی کو میرؔ ایک بے سود عمل قرار دیتے ہیں۔ یہ تشبیہ نہ صرف صورت حال کو واضح کرتی ہے بلکہ محرومی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی کی مسلسل کیفیت کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

ایک عالم کے سر بلا لایا　　　　دل کہ یک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش

یہاں میرؔ نے دل کو 'قطرۂ خوں' کے مشابہ بتایا ہے۔ تشبیہ کا مقصد دل کو ایک نہایت معمولی شے مگر زندگی کی پریشانیوں کا اصل سبب قرار دینا ہے۔

جلا وہ بھی، جِن نے جلایا ہمیں　　　　جلیں پیش و پس، جیسے شمع و پتنگ

اس میں راوی خود کو 'پتنگ' اور جلانے والے کو 'شمع' سے تشبیہ دے رہا ہے۔ مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان 'جلنا' مشترک صفت ہے۔ پہلے مصرعے کی تشبیہ سے دوسرے مصرعے کے مقدمات مزید واضح ہو جاتے ہیں۔

اُسی انداز کی تھی، اشک فشانی اس کی　　　　مینھ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے

یہاں میرؔ نے عاشق کی 'اشک فشانی' کو 'مینھ برسنے' سے تشبیہ دی ہے جس کا مقصد عاشق کے جوشِ گریہ یعنی رونے کی شدت کو نمایاں کرنا ہے۔ تشبیہ ایسی ہے کہ بارش کے منظر کا ایک پیکر ابھرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عاشق کے زار و قطار رونے کی صورت دکھائی دیتی ہے۔

جوشِ گریہ کا مضمون میرؔ کے دوسرے اشعار میں دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ایک انداز دوسرے انداز سے کیسے جدا ہے اور ایک تشبیہ کے مقابلے میں دوسری تشبیہ معنی یا خیال کی ادائیگی کو کیسے الگ کر دیتی ہے۔

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں — جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
سیلاب ہر طرف سے آئیں گے بادیے میں — جوں ابر روتے ہوگا جس دم گذر ہمارا
ہر گل زمین یاں کی رونے ہی کی جا تھی — مانندِ ابر ہر جا میں زار زار رویا
جوں برق تیرے کوچے سے ہنستے نہیں گئے — مانند ابر جب اُٹھے تب گریہ ناک ہم

تشبیہ کے کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

آبلے کی سی طرح، ٹھیس لگی، پھوٹ بہی — دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی
دیکھا تو مثلِ اشک نظر سے گرا دیا — اب میری اس کی آنکھ میں عزت نہیں رہی
یوں تو مُردے سے پڑے رہتے ہیں ہم — پر وہ آتا ہے تو، آجاتا ہے جی
گوہرِ گوش کسو کا نہیں جی سے جاتا — آنسو موتی سے مرے منھ پہ ڈھلے جاتے ہیں

عزیز طلبا! آپ نے دیکھا کہ میر نے اپنے کلام میں کس نفاست کے ساتھ عمدہ تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میر کی تشبیہیں عین فطری ہوتی ہیں۔

(۲) استعارہ

استعارہ شاعری کا بنیادی جوہر اور حسنِ بیان کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ مدعا کی مکمل ترسیل اور کلام میں معنی کی کثرت کے حصول کا استعارے سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ استعارہ کی وضاحت میں ڈاکٹر صادق رقم طراز ہیں:

''استعارہ کے لغوی معنی 'مستعار لینا' ہیں......استعارہ دراصل مجاز ہی کی ایک قسم ہے جس میں لفظ اپنے لغوی معنی کو ترک کر کے لسانی سیاق وسباق کے اعتبار سے نئے معنی مستعار لیتا یا یوں کہیے کہ انھیں آگے بڑھاتا ہے اور اس طور پر زبان نئی وسعتوں سے آشنا ہوتی ہے۔....... تشبیہ اور استعارہ میں گہری مماثلت ہے۔ تشبیہ میں جسے مشبہ کہتے ہیں اس کی جگہ استعارہ میں مستعار لہ ہوتا ہے اور تشبیہ میں جسے مشبہ بہ کہتے ہیں وہ استعارے میں مستعار منہ بن جاتا ہے۔ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ مل کر طرفین تشبیہ کہلاتے ہیں تو یہاں مستعار لہ اور مستعار منہ مل کر 'طرفین

استعارہ' کا نام پاتے ہیں۔........ تشبیہ اور استعارہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ کو مشبہ بہ کے مانند قرار دیا جاتا ہے جب کہ استعارہ میں مشبہ کو بعینہ مشبہ بہ قرار دے دیا جاتا ہے۔

(درسِ بلاغت، ۲۰۱۹، ص:۳۴)

مذکورہ اقتباسات میں استعارہ کے متعلق بنیادی نکات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں قابلِ توجہ اور اہم بات یہ ہے کہ کلام میں کوئی لفظ اگر بطور استعارہ لایا گیا ہے، تو مجازی معنی لفظ کے سیاق وسباق سے ہی حاصل ہوں گے۔ یعنی کوئی لفظ استعارہ ہے یا نہیں، اس کا تعین لفظ کے سیاق وسباق کرتے ہیں۔ ایک مثال کے ذریعے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرؔ کا شعر ہے:

جاتا ہوں آسماں لیے کوچے سے یار کے آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

شعر کا راوی کوچۂ یار سے 'آسمان' لے جانے کی خبر دے رہا ہے۔ ظاہر ہے آسمان ایسی چیز نہیں کہ راوی اُسے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کا لفظ یہاں 'حقیقی' معنی میں نہیں بلکہ 'مجازی' معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اب آسمان کے مرادی معنی کیا ہیں؟ اس کی تلاش آسمان سے وابستہ تصورات کے حوالے سے کی جا سکتی ہے۔ سامنے کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ شعر کا راوی کوچۂ یار سے ایک ناممکن اور ناقابلِ برداشت بوجھ اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ یہ مفہوم 'آسمان' اور 'قابلِ برداشت شے' کو تشبیہی ربط میں لانے سے پیدا ہوتا ہے۔ 'آسمان' کے معنی کی دریافت اور اس کے تعین کے لیے اس لفظ کے دوسرے حوالوں کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں آسمان کو تمام انسانی پریشانیوں اور غم و اندوہ کے نزول کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے ہماری زبان میں سخت مصیبت اور بلاؤں میں گرفتار ہونے کا محاورہ 'آسمان ٹوٹ پڑنا' ہے۔ واضح ہوا کہ 'آسمان' کے لفظ سے میرؔ نے ایک 'ناقابلِ برداشت تکلیف یا غم' کے معنی لیے ہیں۔ آسمان کے معنی 'غم و اندوہ' ہیں، اس پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی (آتا ہے جی بھرا) دوسرے مصرعے میں موجود ہیں اور غم کے اسباب (در و دیوار دیکھ کر) کا ذکر بھی دوسرے مصرعے میں کیا گیا ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ راوی کا انتہائی غم کوچۂ یار کو چھوڑ کر جانا ہے۔ کوچے سے جاتے ہوئے اس کا دل غم سے نڈھال ہے اور وہ کوچے کے در و دیوار کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

اب میرؔ کے کلام سے استعاروں کی مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ میرؔ نے کسی معنی یا خیال کی پیش کش کے لیے جو استعارے خلق کیے ہیں وہ معنی کی ادائیگی میں معاون ہونے کے ساتھ، میرؔ کے اسلوب کو کس طرح انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ شعر ہے:

کیا کہیں تم سے کہ اس شعلے بغیر جی ہمارا کچھ جلا جاتا ہے جی

شعر کا بیانیہ مکمل طور پر استعاراتی ہے۔ معشوق کے لیے میرؔ نے 'شعلے' کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کا تعین سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں معشوق کے لیے روشنی کے جو استعارے استعمال ہوئے ہیں ان میں ماہ، مہتاب، خورشید، شمع، آفتاب کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ خود میر کے کلام میں اس کی مثالیں جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن 'شعلے' کے ساتھ محبوب کی جو صفات روشن ہوتی ہیں وہ دوسرے استعاروں میں اس طرح نمایاں نہیں ہوتیں۔ ماہ، خورشید اور شمع کے استعارے، کسی دوسرے تصور کے مقابلے میں، محبوب کے روشن وجود کے خیال کو زیادہ شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ حالاں کہ شمع کے ساتھ جلانے اور آفتاب کے ساتھ گرمی کا تصور بھی ہے لیکن یہ اوصاف ہمارے ذہن میں بعد میں آتے ہیں۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ یہ استعارے تہذیبی طور پر مثبت قدروں کی علامت ہیں۔ یعنی شمع، آفتاب اور ماہ کا بنیادی کام اندھیرا دور کرنا ہے۔ جب کہ لفظ 'شعلہ' میں مثبت اور منفی دونوں قدریں شامل ہیں۔ شعلہ کے ساتھ رنگ، روشنی اور جلانے کا خیال ایک ساتھ ہمارے دماغ میں آتا ہے۔ اس طرح یہ استعارہ ایک ہی لمحے میں محبوب کی شخصیت کے ایک سے زیادہ پہلو کو روشن کرتا ہے۔

دوسرے مصرعے میں 'جی جلا جاتا ہے' کا استعارہ میرؔ نے محاورے کی سطح پر، عام بول چال میں، تکلیف اور بے چینی کی کیفیت کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ شعر میں قولِ محال کے التزام نے مزید حسن پیدا کیا ہے۔ کسی چیز کے جلنے کے لیے آگ یا شعلہ ضروری ہے لیکن یہاں عاشق کا جی شعلے کے بغیر جل رہا ہے۔

میرؔ کے چند اور شعر ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے معنی کی ترسیل کے لیے استعارہ سازی کی ہے۔

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا　　ہے جی میں، وہیں جا بسیں، ویرانہ جہاں ہو
اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں　　یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے
سبزانِ تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی　　اب دیکھیے تو واں نہیں سایہ درخت کا

کسی ترقی یافتہ، تہذیبی رکھ رکھاؤ والی آبادی اور پُر فضا مقام کی تباہی اور ویرانی کا ایسا دردانگیز بیان کم ملے گا جیسا کہ اوپر کے اشعار میں کیا گیا ہے۔ میرؔ کے یہاں استعارے کے چند اور شعر دیکھیے:

اُس آفتاب بن یاں اندھیرا ہو رہا ہے　　دن بھی سیاہ اپنے جو راتیں کالیاں ہیں
سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا　　پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا
اس گلی سے جی اُچٹتا ٹک نہیں　　دل، جگر کرتے ہیں پتھر ہم بہت

استعارے کی اقسام میں ایک ''استعارہ بالکنایہ'' ہے۔ اس کے متعلق جان لینا ضروری ہے تاکہ 'کنایہ' اور استعارہ بالکنایہ میں خلطِ مبحث نہ ہو۔ کسی خیال یا تصور کو استعارہ کی مدد سے بیان کیا جائے تو معنی پر، مستعار منہ کی مجموعی

صفات حاوی رہتی ہیں جب کہ استعارہ بالکنایہ میں مشبہ کو کسی مخصوص صفت کے حوالے سے اشارتاً بیان قرار دینا مقصود ہوتا ہے۔ مولوی نجم الغنی نے استعارہ بالکنایہ کی تعریف میں لکھا ہے:

''استعارہ بالکنایہ یہ ہے کہ نفس میں تشبیہ دی جاتی ہے اور سوائے مشبہ کے کوئی چیز ذکر نہیں کی جاتی اور بعض چیزیں جو مشبہ بہ کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں وہ مشبہ کے لیے ثابت کی جاتی ہیں۔''

(بحر الفصاحت، ص:۹۲-۷۹۱)

یعنی استعارہ بالکنایہ میں ایک چیز کے لیے کسی دوسری چیز کی بعض خصوصیات ثابت کی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ ''عشق نے اُسے جلا کر راکھ کر دیا''۔ تو یہاں 'عشق' ایک چیز ہے جس میں جلانے کی صفت کو ثابت کیا گیا ہے جب کہ جلانا آگ کی صفت ہے جو ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ اس طرح یہ جملہ استعارہ بالکنایہ کی مثال ہوا کہ اس میں عشق کو براہ راست 'آگ' نہیں کہا ہے بلکہ 'جلانا' جو آگ کی صفت ہے، اس سے عشق کو تشبیہ دی گئی ہے۔

میرؔ نے معنی کے اظہار کے لیے اسے کس طرح برتا ہے اس کی مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔ شعر ہے:

دلِ بے تاب، آفت ہے، بلا ہے　　　جگر سب کھا گیا، اب کیا رہا ہے

اس میں 'دلِ بے تاب' کو میرؔ 'جگر کھانے والا' بتاتے ہیں۔ جگر کھانا درندے کی صفت ہے۔ اس طرح دل کو میرؔ نے کنایہ کے ساتھ درندہ کہا ہے۔

متاعِ دل، اس عشق نے سب جلا دی　　　کوئی دن ہی میں یاں خاک سی اُڑا دی

یہاں 'عشق' کے لیے 'آگ' کی صفت 'جلانا' ثابت کیا گیا ہے۔

روشن ہے جل کے مرنا پروانے کا و لیکن　　　اے شمع کچھ تو کہہ تو تیرے بھی تو زباں ہے

یہاں شمع میں ایک بولنے والے شخص کی صفت (زبان) کو ثابت کیا گیا ہے۔ گویا شمع کو بولنے والے شخص سے تشبیہ دی ہے۔

موئے دل بر سے مشک بو ہے نسیم　　　حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

میرؔ نے مشبہ (موئے دل بر) کو مشبہ بہ (مشک) سے تشبیہ دی ہے۔ مشک کا ذکر کیے بغیر نسیم کا مشک بو ہونا دراصل مشبہ میں مشبہ بہ کی صفات کو قائم کرنا ہے۔

(۳) مجاز مرسل

لفظ کو مجازی معنی میں اس طرح استعمال کرنا کہ اس کے حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہو، مجازِ مرسل کہلاتا ہے۔ علمائے بلاغت نے اس کی چوبیس قسمیں بتائی ہیں، جن میں سے چند یہاں بیان کی جاتی ہیں اور میرؔ کے کلام سے اس کی مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ کُل کہہ کر جزو مراد لینا؛

یعنی لفظ 'کُل' کے لیے بولا جاتا ہو لیکن بولنے والا اس سے 'جزو' مراد لے۔ مثلاً 'ہاتھ' کُل ہے اور 'بازو، کہنی، ساعد، کلائی، ہتھیلی، انگلیاں' ہاتھ کا جزو ہیں۔ چنانچہ لفظ 'ہاتھ' بولا جائے اور اس سے ہاتھ کا کوئی جزو مراد ہو، تو اسے 'کل کہہ کر جزو مراد لینا' کہتے ہیں۔ مثلاً کہا جائے کہ فلاں نے ہاتھ میں چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ یا فلاں نے ہاتھ میں انگوٹھی پہنی ہے۔ یا فلاں کے ہاتھ پر امام ضامن بندھا ہے، تو ان سبھی جملوں میں ہاتھ بطور کُل بولا جا رہا ہے لیکن اس سے مراد 'جزو' یعنی کلائی، انگلی، بازو ہیں۔ اس لیے کہ چوڑیاں کلائی میں ڈالی جاتی ہیں، انگوٹھی انگلی میں پہنتے ہیں اور امام ضامن بازو پر باندھا جاتا ہے۔ میرؔ کا شعر ہے:

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ　　　جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

درد یا تکلیف کی جگہ کی تشخیص کے لیے جسم پر انگلیاں اور ہتھیلی رکھ کر دیکھتے ہیں، پورا ہاتھ نہیں رکھتے۔ میرؔ نے 'ہاتھ' (کُل) کہہ کر 'انگلیاں اور ہتھیلی' (جزو) مراد لیا ہے۔

۲۔ جزو کہہ کر کُل مراد لینا

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے　　　بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

یہاں 'ساعد' (پہنچا سے کہنی تک کا حصہ) جو ہاتھ کا جزو ہے اُسے میرؔ نے کُل یعنی ہاتھ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

۳۔ سبب کہہ کر مسبب مراد لینا؛

میرے حضور شمع نے گریہ جو سر کیا　　　رویا میں اس قدر کہ مجھے آب لے گیا

اس شعر میں 'آب' سے مراد 'سیلاب' ہے۔ آب سبب ہے اور سیلاب مسبب۔

۴۔ظرف کہہ کر مظروف مراد لینا؛

آہ سحر نے سوزش دل کو مٹا دیا　　اس باؤ نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

کیا جیب وآستیں ہی سیلاب خیز ہے یاں　　دریا بہا کریں ہیں میرے کنار سے بھی

پہلے شعر میں ’دیا‘ اور دوسرے شعر میں ’دریا‘ ظرف ہیں اور ان میں موجود یا رکھی ہوئی چیزیں مظروف ہوں گی۔ دیا میں بتی ہوتی ہے اور یہی جلائی یا بجھائی جاتی ہے، دیا نہیں۔ اسی طرح دریا نہیں بہتا بلکہ اس میں موجود پانی بہتا ہے۔لیکن میرؔ نے مذکورہ دونوں ہی شعر میں ’ظرف‘ کہہ کر مظروف مراد لیا ہے۔

(۴) کنایہ

قاضی افضال حسین ’کنایہ‘ کے متعلق لکھتے ہیں:

’’اس میں مستعمل لفظ کے مجازی معنی کے ساتھ حقیقی معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں جس سے شعر میں ایک خاص قسم کا ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور شعر کی رمزی وایمائی کیفیت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔‘‘

(میر کی شعری لسانیات، ص:۴۱)

درسِ بلاغت میں اس کے بیان میں لکھا ہے:

’’اس میں ملزوم کہہ کر لازم مراد لی جاتی ہے۔کنایہ کے طور پر برتے جانے والے الفاظ اپنے مروجہ لغوی معنی سے علاحدہ مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں لیکن اس التزام کے ساتھ کہ ان سے لغوی معنی بھی مراد لیے جاسکیں۔‘‘

(درسِ بلاغت، ۲۰۱۹، ص:۴۳)

کنایہ اور استعارہ بالکنایہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کنایہ میں لفظ اپنی لغوی اور مجازی دونوں معنی میں استعمال ہوسکتا ہے جب کہ استعارہ یا استعارہ بالکنایہ میں لفظ کے حقیقی معنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔شعر کے ایمائی اظہار کا وسیلہ ہونے کے سبب، کنایہ کلام کو سادہ اور بے لطف بیانیہ ہونے سے بچالیتا ہے۔

میرؔ کے کلام میں کنایہ کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی تیرے در پہ ہم　　قدِ خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

اس شعر میں ’قدِ خم گشتہ‘ کنایہ ہے کمزوری ولاغری سے اور چونکہ پیری میں آدمی کا قد جُھک جاتا ہے اس لیے پیری کی رعایت اس کے لغوی معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں۔مثلاً:

مجازی معنی: اے محبوب عہدِ پیری میں بھی ہم تیرے در پہ نالہ و فریاد کر رہے ہیں اور اب تیرے در سے ہم جانا بھی چاہیں تو جا نہیں سکتے کہ لاغری ہمارے پیروں کی زنجیر ہو گئی ہے۔

حقیقی معنی: اے محبوب عہدِ پیری میں بھی ہم تیرے در پہ آہ و زاری کر رہے ہیں۔ اب تیرے در سے ہم چاہ کر بھی نہیں جا سکتے کہ پیری کے سبب ہمارے پیروں میں خَم آ گیا ہے اور یہ خَم پیر کی زنجیر ہو گیا ہے۔

جو دیکھیں ہم نے، یہی خود نمائیاں دیکھیں   ہمیشہ مائلِ آئینہ ہی تجھے پایا

'مائلِ آئینہ' کنایہ ہے 'آرائش و زیبائش' کرنے سے اور چوں کہ خود کو سنوارنے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑا ہونا لازم ہے اس لیے حقیقی معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

آنسو موتی سے مرے منھ پہ ڈھلے جاتے ہیں   گوہرِ گوش کسو کا نہیں جی سے جاتا

'گوہرِ گوش' کنایہ ہے محبوب کا۔ لیکن اس سے حقیقی معنی 'کان کا آویزہ' بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

12.3.2 علم بدیع

مولوی نجم الغنی 'بحر الفصاحت' میں لکھتے ہیں:

''بدیع ایک علم ہے یعنی ملکہ ہے جس سے چند امور ایسے معلوم ہو جاتے ہیں جو خوبیِ کلام کا باعث ہوتے ہیں...... منفعت اس کی یہ ہے کہ کلام میں ایسی خوبی پیدا ہو جائے کہ کانوں کو بھلا معلوم ہو اور دل میں اثر کر جائے۔''

(ص: ۸۳۰)

ابوالفیض سحر رقم طراز ہیں:

''علم بدیع بلاغت کا ایک اہم شعبہ ہے...... اس شعبے میں کلام میں استعمال ہونے والی صنعتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے...... شاعری میں ایسے پیرایۂ اظہار اور اسلوبِ بیان کا اہتمام کرنا جو محض ادائے مطلب کے لیے ضروری نہیں بلکہ کلام میں مزید حسن و لطافت اور مزید معنی پیدا کرے، صنعت کہلاتا ہے۔''

(درسِ بلاغت، ۲۰۱۹، ص: ۴۶)

گویا علم بدیع، کلام کے حسن اس کی خوبی اور تاثیر میں اضافہ کے ذرائع کا علم ہے، جسے صنعت کہتے ہیں۔ ماہرین بلاغت نے اسے 'صنائع معنوی' اور 'صنائع لفظی' میں تقسیم کیا ہے۔ صنائع معنوی سے مراد وہ صنعتیں ہیں جن سے

شعر کے ظاہری حسن اور تاثیر میں اضافے کے ساتھ شعر کی معنی میں بھی وسعت پیدا ہو۔ جب کہ 'صنائع لفظی' سے مراد وہ خوبیاں ہیں جو لفظوں کو خاص ترتیب اور رعایت سے برتنے پر شعر میں ظاہر ہوتی ہیں۔

میرؔ کے کلام میں صنائع و بدائع کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔ بعض صنعتوں کو میرؔ نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً رعایت لفظی اور تضاد کی صنعتیں۔ اس میں بھی رعایت لفظی کا التزام اس طرح ملتا ہے کہ شاید ہی کوئی غزل ہو جس کے اشعار میں یہ صنعت موجود نہ ہو۔ یہاں تمام صنعتوں کو بیان کرنے کے بجائے ان مخصوص صنعتوں کا ذکر کیا جائے گا جس کو میر نے بہ کثرت استعمال کیا ہے۔

ایہام:

اسے ''توریہ'' بھی کہتے ہیں۔ ایہام کے لغوی معنی ہیں ''وہم میں ڈالنا'' اور توریہ کے معنی ہیں ''چھپانا''۔ اصطلاح میں ایہام اسے کہتے ہیں کہ شاعر کلام میں ایسا لفظ استعمال کرے جس کے دو معنی ہوں، اور سننے والا کچھ دیر کے لیے وہم میں پڑ جائے کہ لفظ کے صحیح معنی کیا ہیں۔ ایسے لفظ کے عموماً دو معنی ہوتے ہیں، ایک قریب کے اور دوسرے بعید کے۔ معنیِ قریب سے مراد لفظ کے وہ معنی ہیں جو کثرت استعمال کے سبب سننے والے کے ذہن میں فوراً آ جائیں اور معنی بعید وہ ہیں جو ذرا غور و فکر کے بعد سامع کے ذہن میں آئیں۔

میر کی شاعری میں ایہام کی مثالیں عام نہیں ہیں۔ مسلسل کئی غزلوں کے مطالعے کے بعد مشکل سے یہ صنعت ان کے کلام میں نظر آتی ہے۔ ایہام کو میر نے محض اپنی لسانی قدرت کے اظہار کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔ اِسے وہ معنی میں اضافہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایہام کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا   درہمی حال کی ساری ہے مرے دیواں میں

اس شعر میں لفظ 'حال' اور 'مجموعہ' میں ایہام ہے۔ حال کا ایک مطلب 'حالت یا کیفیت' ہے اور دوسرے 'موجودہ زمانہ' کے ہیں۔ پہلے معنی کے مطابق شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میری حالت یا کیفیت کا سارا انتشار میرے دیوان میں موجود ہے اور چوں کہ تمام انتشار و پریشانی کو اس دیوان میں یکجا کر دیا گیا ہے اس لیے میرا دیوان گویا پریشانی کا مجموعہ بن گیا ہے۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ موجودہ زمانے کی ساری برہمی اور سارا انتشار میرے دیوان میں موجود ہے۔ تم اگر زمانۂ حال کی پریشانیوں اور بکھراؤ کو دیکھنا چاہتے ہو تو میرے دیوان کی سَیر کرو، اس لیے کہ یہ دیوان ساری تباہی و انتشار کا مجموعہ ہے۔

اسی طرح 'مجموعہ' کے لفظ میں بھی ایہام ہے۔ 'دیوان' کی مناسبت سے مجموعہ کا مطلب ''شاعری کی کتاب'' ہے جب کہ 'درہمی حال' کے تعلق سے 'مجموعہ' بکھرے ہوئے حالات و واقعات کو یکجا کرنے کے معنی میں ہے۔

دوسرا شعر دیکھیے:

کم ہے کیا لذتِ ہم آغوشی؟ سب مزے میر درکنار رہے

اس شعر میں ''درکنار'' کا لفظ بطور ایہام لایا گیا ہے۔ اس لفظ کے ایک معنی 'بغل میں، قریب، نزدیک' کے ہیں اور دوسرے معنی ''جدا، الگ، دور'' کے ہیں۔

پہلے مصرعے کے استفہام ''کم ہے کیا؟'' میں یہ جواب پوشیدہ ہے کہ ہم آگوشی کی لذت کم نہیں ہے۔ دوسرے مصرعے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ہم آغوشی کی لذت کے مقابلے میں عاشق یا میرؔ کے لیے دوسری تمام لذتیں بہت کمتر درجے کی ہیں۔ عاشق کو جب معشوق کا وصال اور اس کی ہم آغوشی حاصل ہے تو ایسے میں اس کی توجہ لذت کی دوسری چیزوں کی طرف نہیں جاتی۔ گویا لذت کی دوسری تمام چیزیں عاشق سے 'درکنار' یعنی دور ہو گئیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ معشوق سے ہم آغوش ہونا کم لذت کی بات نہیں۔ یہ ہم آغوشی گویا تمام لذتوں سے بغل گیر ہونا ہے۔ شعر ہے:

سوچے تھے، کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود
اب دیکھتے ہیں، اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے

شعر کے پہلے مصرعے کے لفظ 'سودا' اور دوسرے مصرعے کے لفظ 'جی' میں ایہام ہے۔ سودا کا ایک مطلب 'دیوانگی یا جنون' ہے اور دوسرا مطلب 'تجارت اور خرید وفروخت' ہے۔ اسی طرح جی کا ایک مفہوم 'دل' اور دوسرا 'جان' ہے۔

شعر کا پہلا مفہوم: میں نے سوچا تھا کہ محبت کی تجارت میں کچھ فائدہ ہے لیکن جب کاروبار محبت میں شامل ہوا تو معلوم ہوا کہ اس میں تو دل ہی کا نقصان ہے۔

دوسرا مفہوم: میں نے سوچا تھا کہ محبت کی تجارت میں کچھ فائدہ ہے لیکن جب کاروبار محبت میں شامل ہوا تو معلوم ہوا کہ اس میں تو جان ہی کا نقصان ہے۔

تیسرا مفہوم: میں نے سوچا تھا کہ محبت کی دیوانگی میں تھوڑا بہت فائدہ ہے لیکن جب دیوانگی اختیار کی تو معلوم ہوا کہ اس میں تو دل ہی کی بربادی ہے۔

چوتھا مفہوم: میں نے سوچا تھا کہ دیوانگیٔ محبت میں کچھ فائدہ ہے لیکن جب دیوانگی اختیار کی تو معلوم ہوا کہ اس میں تو جان ہی کا نقصان ہے۔

دوسرے اشعار دیکھیے :

آگے ایسا نکھرا نکھرا کاہے کو میں پھرتا تھا　　جب سے آنکھ لگی اس منھ سے رنگ مرا مہتابی ہے
منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی　　حق جو کہے ہے اس کو یاں دار کھینچتے ہیں

پہلے شعر کے لفظ 'مہتابی' اور دوسرے شعر کے 'حق' میں ایہام ہے۔

تجاہلِ عارفانہ:

لغت میں اس کے معنی ہیں ''جان بوجھ کر انجان بننا''۔ یہ صنعت اس طرح قائم ہوتی ہے کہ کسی چیز کے متعلق جاننے کے باوجود، اس سے اپنی لاعلمی اور بے خبری ظاہر کی جاتی ہے۔شعرا عموماً اس صنعت کا استعمال کسی شے یا امر کی تعریف میں مبالغے کے لیے کرتے ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

لطف اس کے بدن کا کیا کہوں میرؔ　　کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے

اس شعر میں 'لطفِ بدن' کے مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ محبوب کا جسم ایسا لطیف اور ہلکا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے جسم کہیں یا روح۔ یہاں شعر کا دوسرا مصرعہ بطور تجاہل لایا گیا ہے۔

کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں　　جو آنسو مری آنکھوں سے گرتا ہے شرر ہے

واضح ہے کہ آنکھ سے آنسو تکلیف اور غم کی وجہ سے جاری ہوتے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ آنسو گرم ہوتے ہیں اور گرمی و حرارت کی بنا پر میرؔ نے آنسو اور شرر میں ایک تعلق قائم کیا ہے۔ اب تجاہل کے ساتھ یہ سوال کرنا کہ 'کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں' دراصل تکلیف اور شدتِ غم کی کیفیت کو نمایاں کرنا ہے۔

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے جاگ اٹھے ہو　　ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

دوسرا مصرعہ بطور تجاہل کے آیا ہے۔

طباق یا تضاد:

جب کلام میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں، تو اسے صنعتِ طباق یا تضاد کہتے ہیں، جیسے ہلکا اور بھاری، نیک اور بد، رات اور دن وغیرہ۔ تضاد کی یہ صورت اسم، فعل، حرف اور دوسری شکلوں میں بھی ہو سکتی ہے۔ علمائے بلاغت نے طباق یا تضاد کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔ یہاں صرف ان دو اقسام کو بیان کیا جائے گا جسے شعرا نے کثرت سے استعمال کیا ہے اور جو میرؔ کے کلام میں بھی جگہ جگہ بہ

آسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔

(الف) طباق ایجابی: کلام میں ایسے دو لفظوں کا استعمال کرنا جو باہم متضاد ہوں لیکن ان کے ساتھ حرفِ نفی نہ لگا ہو طباقِ ایجابی کہلاتا ہے۔ میرؔ کے یہاں اس صنعت کے حسنِ استعمال کی صورتیں ملاحظہ کیجیے:

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے　　　ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

یہاں 'اجڑا اور بسایا' میں طباق ایجابی ہے۔

پیدا ہے کہ پنہاں تھی آتش نفسی میری　　　میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا

'پیدا اور پنہاں' کے الفاظ میں تضاد ہے اور یہ طباقِ ایجابی کی مثال ہے۔

اضطراب اِس کا نہیں ہوتا ہے کم　　　ہاتھ بھی رکھتے ہیں دل پر ہم بہت

'کم اور بہت' میں طباق ایجابی ہے۔

اب اپنے قد راست کو خم دیکھتے ہیں ہائے　　　ہستی کے تئیں ہوتے عدم، دیکھتے ہیں ہائے

اس میں 'راست اور خم، ہستی و عدم' کے الفاظ باہم متضاد ہیں۔

(ب) طباقِ سلبی: جب کلام میں دو الفاظ ایسے آئیں جو ایک ہی مصدر سے مشتق ہوں لیکن ان میں سے ایک مثبت ہو اور دوسرا منفی، اور ان کا تضاد حرف نفی سے واضح ہو۔ مثلاً ممکن اور ناممکن، آنا اور نہ آنا، طباقِ سلبی ہیں۔

میرؔ کے کلام سے اس کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ہونا جہاں کا اپنی آنکھوں میں ہے نہ ہونا　　　آتا نظر نہیں کچھ جاوے نظر جہاں تک

اس شعر میں 'ہونا اور نہ ہونا' میں طباقِ سلبی ہے۔

پھر بخود آئے نہ بدحالی میں، بے خود جو ہوئے　　　آپ سے جاتے ہیں ہم بھی، تو بھلے جاتے ہیں

اس میں 'بخود اور بیخود' میں طباقِ سلبی ہے اور 'آپ اور ہم' میں طباقِ ایجابی۔

جی کو نہیں لاگ لامکاں سے　　　ہم کو ئی دل مکاں بہت ہے

اس شعر میں 'لامکاں اور مکاں' طباقِ سلبی ہے۔

تلمیح:

کسی مشہور تاریخی نام، واقعے، قصے، کسی مسئلے یا علم وفن کی اصطلاح کی طرف شعر میں اشارہ کرنا، تلمیح ہے۔ تلمیح

کے شعر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُس تلمیح کی تفصیل سے واقف ہوں جسے شاعر نے استعمال کیا ہے۔ تلمیح کو شاعر کسی مسئلے یا نقطۂ نظر کو واضح کرنے اور اُسے شدت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ کلامِ میرؔ سے تلمیح کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز　　میر اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا
بے ستوں کیا ہے؟ کوہ کن کیسا؟　　عشق کی زور آزمائی ہے
لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا　　کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

ان اشعار میں میرؔ نے چند شخصیات کے نام کو معنی و خیال کی کامیاب ترسیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ تلمیحی حوالے شعر میں بیان کردہ تجربے کو شدت کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں۔

وقت ایک قیمتی شے ہے اور اس کی حفاظت لازمی ہے۔ اس خیال کو میرؔ نے یوسفؑ سے وابستہ واقعے، جس میں وہ اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں، اور وقت کی قدر کو عزیزِ مصر کے اہم ترین منصب کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ دوسرے شعر میں 'بے ستوں اور کوہ کن' کے حوالے سے ہمارے تخیل میں جو واقعہ روشن ہوتا ہے، میرؔ نے اس کی نفی کی ہے۔ زندگی کے عمل میں کوہ کن اور بے ستوں جیسی تمام مثالوں کو میرؔ عشق کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ مثال کے آخری شعر میں 'جان کھپانے' یا موت کی منزل سے گذرنے کو میرؔ زندگی کی ایک اہم لذت قرار دیتے ہیں۔ لذت کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لیے وہ خضر اور مسیح کا نام لاتے ہیں کہ ان شخصیات کو موت کی لذت نصیب نہیں ہوئی۔ یہاں موت، زندگی کے تجربے کی وہ انتہائی منزل ہے جس میں میرؔ اور دوسرے افراد، خضر و مسیح سے آگے نکل جاتے ہیں۔

تنسیق الصفات:

علمائے بلاغت نے اسے صنائع لفظی میں بھی رکھا ہے۔ شعر میں کسی شخص یا چیز کی صفات کو متواتر بیان کرنا، خواہ یہ صفات مدح کی ہوں یا ذم کی، تنسیق الصفات کہلاتا ہے۔

اس صنعت سے میرؔ نے شخصیت کے جو خاکے بنائے ہیں اُسے ملاحظہ کیجیے۔

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار　　تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

شعر کے پہلے مصرعے میں غم زدہ میر کی صفات یا اس کے حلیے کا بیان یوں کیا گیا ہے کہ شکستہ حال میرؔ کی شخصیت اپنے تمام خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ غم کی شدت کے آثار میر کے جسم پر اس طرح نمایاں ہیں کہ اس کا قد جُھک گیا ہے، چہرے کی رونق ختم ہو چکی ہے اور جسم لاغری کے سبب بہت ہی دبلا پتلا نظر آتا ہے۔

'تنسیق' کے چند اور شعر دیکھیے:

کرے ہے جس کو ملامت جہاں، وہ میں ہی ہوں　　　اجل رسیدہ، جفا دیدہ، اضطراب زدہ
کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ کھڑا تھا　　　نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

حسن تعلیل:

حسنِ تعلیل کے معنی ہیں ''خوبصورت وجہ بیان کرنا''۔ جب کسی چیز یا واقعہ کے ہونے کا اصل سبب کچھ اور ہو لیکن شاعر کلام میں اس کے ہونے کی کوئی اور شاعرانہ وجہ بیان کرے، تو اسے حسنِ تعلیل کہتے ہیں۔

یہ صنعت، صفات میں مبالغے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ میرؔ نے کلام میں اس سے کس طرح کام لیا ہے ملاحظہ کیجیے:

شہر میں کس منھ سے آوے سامنے تیرے کہ شوخ
چھائیوں سے بھر رہا ہے سارا چہرہ ماہ کا

مہینے کی آخری تاریخوں میں چاند کا نظر نہ آنا اور چاند میں دھبے کا ہونا دونوں فطری باتیں ہیں۔ لیکن شاعر چاند کے داغوں کو 'جھائیاں' بتا کر محبوب کے سامنے نہ آنے کا سبب یہ بیان کرتا ہے کہ چاند کا چہرہ جھائیوں سے بھر گیا ہے، جس کا خیال اُسے شرمندہ کرتا ہے اور اسی وجہ سے وہ محبوب کے سامنے نہیں آتا۔ اس تعلیل کا مقصد محبوب کے رخِ روشن کی تعریف میں مبالغہ کرنا ہے۔

دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں　　　سیلی لگی صبا کی سو منھ لال ہو گیا

اس شعر میں بھی محبوب کے حسن کا بیان مقصود ہے۔ گل کی رنگت فطری طور پر سرخ ہوتی ہے اور ہوا کے تیز چلنے پر وہ جھومتے بھی ہیں۔ لیکن میرؔ گل کی سرخی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ پھول نے باغ میں محبوب سے زیادہ حسین ہونے کا دعویٰ کیا تھا جس پر صبا نے گل کو طمانچہ رسید کیا اور گل کا منھ لال ہو گیا۔

ہر ذرۂ خاک تیری گلی کی ہے بے قرار　　　یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

یہاں خاک کے ذروں کی بے قراری سے عاشق پر ہونے والے ظلم کی شدت کو نمایاں کرنا ہے۔ ہوا کے زور سے خاک کے ذروں کا اڑتے پھرنا ایک فطری امر ہے۔ محبوب کی گلی کی خاک کے ذروں کی بے قراری کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کسی ستم زدہ عاشق کا جسم اس مٹی میں مل گیا ہے اور عاشق کے جسم کے ساتھ اس کا اضطراب بھی اس مٹی میں آ گیا ہے، اس لیے معشوق کی گلی کی مٹی کے ذروں میں بے قراری ہے۔

چند اور شعر ملاحظہ کیجیے:

شوقِ قامت میں ترے اے نونہال　　گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں
بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو　　چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا

لف و نشر:

لغت میں لف کے معنی 'لپیٹنا' اور نشر کے معنی ہیں 'پھیلانا' ہے۔ علم بدیع کی اصطلاح میں، شعر میں پہلے چند چیزوں کا ترتیب سے ذکر 'لف' کہلاتا ہے۔ اس کے بعد انھیں چیزوں یا ان کے مناسبات یا صفات کو، اسی ترتیب یا دوسری ترتیب میں بیان کرنا 'نشر' کہلاتا ہے۔ اگر دوسرے مصرعے میں اشیا کا ذکر پہلے مصرعے میں بیان کی گئی چیزوں کی ترتیب کے مطابق ہو، تو اسے 'لف و نشر مرتب' کہتے ہیں۔ لیکن اگر دونوں مصرعوں میں بیان کی گئی چیزوں کی ترتیب مختلف یا برعکس ہو، تو اسے 'لف و نشر غیر مرتب' کہتے ہیں۔

میر کے کلام سے مثالیں ملاحظہ کیجیے:

(۱) لف و نشر مرتب:

شرکتِ شیخ و برہمن سے میر　　کعبہ و دیر سے بھی جایئے گا

'شیخ' کی نسبت سے دوسرے مصرعے میں پہلے 'کعبہ' اور پھر 'برہمن' کی نسبت سے 'دیر' کا لفظ بالترتیب آیا ہے۔ لہٰذا یہاں لف و نشر مرتب ہے۔

(۲) لف و نشر غیر مرتب:

جب ملنے کا سوال کروں ہوں زلف و رخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یوں ہی گذرے صبح و شام بتاتے ہو

'زلف' کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں 'شام' اور پھر 'رخ' کی مناسبت سے 'صبح' لایا گیا ہے اور لفظوں کی ترتیب اُلٹ دی گئی ہے۔ ترتیب کے الٹ جانے سے یہاں صنعت لف و نشر غیر مرتب ہے۔

گل و سنبل ہیں نیرنگِ قضا مت سرسری گذرے
کہ بگڑے زلف و رخ کیا کیا بناتے اس گلستاں میں

شعر کے دوسرے مصرعے میں 'گل' کی مناسبت سے 'رخ' اور 'سنبل' کی مناسبت سے 'زلف' آیا ہے۔ یہاں بھی میر نے دوسرے مصرعے میں لفظوں کی ترتیب اُلٹ دی ہے۔

سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا
بجھ ہی جاتے ہیں دیے جس وقت سب روغن جلا

'آنسو' کی نسبت سے دوسرے مصرعے میں 'روغن' اور 'آنکھ' کی مناسبت سے 'دیے' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

مراعات النظیر :

اسے صنعتِ تناسب، توفیق اور تلفیق بھی کہتے ہیں۔ کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جو آپس میں ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہوں لیکن یہ تعلق تضاد کا نہ ہو، یعنی معنی کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں مثلاً: رات اور دن، صبح و شام، زمین و آسمان، جیسے متضاد الفاظ نہ ہوں بلکہ گل، بلبل، باغ، شجر، برگ، طائر، صیاد جیسے الفاظ، مراعات النظیر کہلاتے ہیں۔

بلبل، گل کو پسند کرتا ہے، پھر گل اور بلبل دونوں کا باغ سے ایک رشتہ ہے۔ اسی طرح شجر کا بھی باغ اور بلبل اور طائر سے تعلق ہے۔ برگ یعنی پتے، درخت اور گل سے مناسبت رکھتے ہیں۔ صیاد کا طائر یا بلبل سے تعلق ہے۔ اس طرح گل سے لے کر صیاد تک کے الفاظ میں ایک نسبت موجود ہے۔

میرؔ نے اپنے کلام میں اس صنعت کو سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ درج ذیل مثالیں ملاحظہ کیجیے:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے ‏ ‏ ‏ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

پتا، بوٹا، گل، باغ کے الفاظ میں تناسب یا رعایت ہے۔

وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی ‏ ‏ ‏ دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

منزل، راہ، غریب، گیا، میں رعایت ہے۔

مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ‏ ‏ ‏ دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

حرف، مٹ گیا، جریدہ، فرد میں رعایت ہے۔

گوہرِ گوش کسو کا نہیں جی سے جاتا ‏ ‏ ‏ آنسو موتی سے مرے، جی سے ڈھلے جاتے ہیں

گوہر، گوش، آنسو، موتی، ڈھلے جانا میں رعایت ہے۔

تجنیس:

شعر میں دو لفظ شکل یا آواز میں مشابہ ہوں اور معنی میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو تجنیس کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ تجنیس کی تعمیر اور اس کے شعری کردار کے متعلق قاضی افضال حسین لکھتے ہیں:

> ''تجنیس لفظی صنعت ہے جس میں بعض الفاظ و حروف کی تکرار صنعت کی تعمیر کا سبب بنتی ہے۔ حروف کے حذف یا تکرار کے سبب لفظی صنعتوں کا اثر شعر کی صوتیات پر پڑتا ہے اور شعر کا صوتی

نظام ان صنعتوں کے استعمال سے بعض مخصوص صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔''

(میر کی شعری لسانیات، ص:۲۱۷)

علمائے بلاغت نے اس کی بہت سی قسمیں بتائی ہیں۔ میرؔ کے کلام میں 'تجنیس تام' کی مثالیں بہ آسانی ملتی ہیں۔ یعنی ایسے الفاظ کی تکرار جو حروف کی نوع، تعداد، ترتیب اور حرکات وسکنات میں ایک جیسے ہوں لیکن معنی میں الگ ہوں۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہ عالم میں ہے، نے عالم سے باہر　　پہ، سب عالم سے عالم ہی جدا ہے

لفظ 'عالم' بہ تکرار آیا ہے۔ شعر میں اس کے ایک معنی 'دنیا' ہیں اور دوسرے معنی 'کیفیت یا حالت' کے ہیں۔

نہ سوزِ دروں فصلِ گل میں چھپا　　سرو سینہ سے داغ نے گل کیا

پہلے مصرعے میں 'گل' بمعنی پھول آیا ہے جب کہ دوسرے مصرعے میں گل بمعنی 'ظاہر ہونا' استعمال ہوا ہے۔

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا　　اس بار نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

پہلے اور دوسرے مصرعہ کے آخر میں 'دیا' فعل کا حصہ ہے جب کہ دوسرے مصرعے کے درمیان میں 'دیا' چراغ کے معنی میں لایا گیا ہے۔

سرسری مت جہاں سے جا، غافل!　　پاؤں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ

پہلے مصرعے میں جہاں 'دنیا' کے معنی میں آیا ہے جب کہ دوسرے مصرعے میں جہاں 'مقام یا جگہ' کے لیے استعمال ہوا ہے۔

12.3.3 ماحصل

علمِ بیان وبدیع کے حوالے سے میر تقی میرؔ کے کلام کا یہ مطالعہ واضح کرتا ہے کہ میرؔ نے معنی، خیال، جذبہ، کیفیت اور صورتِ حال کی مؤثر اور فنکارانہ ترسیل کے لیے اظہار کے مختلف ذرائع اختیار کیے ہیں۔ تشبیہ کے وسیلے سے میرؔ نے معنی وخیال کے کسی لطیف پہلو کو مجسم صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ استعارہ، ان کے شعری تجربے کا بے کم وکاست اظہار ہے اور اس کے ذریعہ وہ کلام میں معنی کی ایک سے زیادہ جہتیں پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح کنایہ اور استعارہ بالکنایہ بلکہ مجاز کی تقریباً جتنی قسمیں زیرِ بحث آئی ہیں، ان سے میرؔ نے شعری بیان میں لطف، اثر انگیزی اور معنی کے مختلف زاویے پیدا کیے ہیں۔ اس کے علاوہ صنائع معنوی کے استعمال میں بھی میرؔ کے یہاں، شعر کے ظاہری حسن میں اضافے کے ساتھ شدتِ معنی کو حاصل کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ کلام کی خوش آہنگی

میں اضافے کے لیے لفظی صنعتوں کا التزام بھی ان کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- علم بیان کے تصور کو سمجھا اور اس کے متعلقات کے بارے میں جانا۔
- تشبیہ اور استعارہ کے درمیان فرق و تعلق کو وضاحت کے ساتھ سمجھا۔
- تشبیہ و استعارہ کے حوالے سے میرؔ کے کلام کی انفرادیت سے واقفیت حاصل کی۔
- علم بیان اور علم بدیع کے امتیازات کو سمجھا۔
- صنائع معنوی اور صنائع لفظی کی مختلف اقسام کی تعریف اور میرؔ کے کلام سے اس کی مثالیں دیکھیں۔

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ علم بیان سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔

۲۔ استعارہ اور تشبیہ کے مابین افتراق و مماثلت واضح کیجیے۔

۳۔ کنایہ اور استعارہ بالکنایہ میں کیا فرق ہے؟ بیان کیجیے۔

۴۔ لف نشر غیر مرتب پر مبنی میر کا کوئی شعر درج کر کے صنعت کی توضیح کیجیے۔

۵۔ میرؔ نے جس صنعت کو سب سے زیادہ برتا ہے اس کی تعریف کیجیے اور بطور نمونہ ایک شعر لکھیے۔

12.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ علم بیان اظہار کے ان طریقوں اور قاعدوں کا علم ہے جس کے جاننے کے بعد ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ کسی بات، خیال یا معنی کو مختلف انداز میں کس طرح لکھا یا ادا کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ ایک انداز بیان، معنی و خیال کو، دوسرے انداز بیان کے مقابلے میں کس طرح زیادہ واضح کرتا ہے۔

۲۔ تشبیہ اور استعارہ میں گہری مماثلت ہے۔ تشبیہ میں جسے مشبہ کہتے ہیں اس کی جگہ استعارہ میں مستعار لہ ہوتا ہے اور تشبیہ میں جسے مشبہ بہ کہتے ہیں وہ استعارے میں مستعار منہ بن جاتا ہے۔ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ مل کر طرفین تشبیہ کہلاتے ہیں تو یہاں مستعار لہ اور مستعار منہ مل کر 'طرفین استعارہ' کا نام پاتے ہیں۔........ تشبیہ اور استعارہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ کو مشبہ بہ کے مانند قرار دیا جاتا ہے جب کہ استعارہ میں مشبہ کو بعینہٖ مشبہ بہ قرار دے دیا جاتا ہے۔

۳۔ کنایہ اور استعارہ بالکنایہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کنایہ میں لفظ اپنی لغوی اور مجازی دونوں معنی میں استعمال ہوسکتا ہے جب کہ استعارہ یا استعارہ بالکنایہ میں لفظ کے حقیقی معنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔

۴۔ لف ونشر غیر مرتب پر مبنی میر کا شعر:

جب ملنے کا سوال کروں ہوں زلف و رخ دکھلاتے ہو
برسوں مجھ کو یوں ہی گذرے صبح و شام بتاتے ہو

مذکورہ شعر میں 'زلف' کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں 'شام' اور پھر 'رخ' کی مناسبت سے 'صبح' لایا گیا ہے اور لفظوں کی ترتیب اُلٹ دی گئی ہے۔ ترتیب کے الٹ جانے سے یہاں صنعت لف ونشر غیر مرتب ہے۔

۵۔ میر نے سب سے زیادہ اپنے کلام میں صنعت مرعات النظیر کو برتا ہے۔ اسے صنعتِ تناسب، توفیق اور تلفیق بھی کہتے ہیں۔ کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جو آپس میں ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہوں لیکن یہ تعلق تضاد کا نہ ہو، یعنی معنی کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں مثلاً: رات اور دن، صبح وشام، زمین وآسمان، جیسے متضاد الفاظ نہ ہوں بلکہ گل، بلبل، باغ، شجر، برگ، طائر، صیاد جیسے الفاظ، مراعات النظیر کہلاتے ہیں۔ مثال دیکھیے:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے   جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

پتا، بوٹا، گل، باغ کے الفاظ میں تناسب یا رعایت ہے۔

12.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
خدائے سخن	:	شاعری کا خدا، باکمال شاعر، شاعری کا بادشاہ
سہلِ ممتنع	:	وہ آسان کلام جس سے زیادہ آسان کہنا مشکل ہو
اعجاز	:	انفرادیت، بے مثل، حیرت انگیز بات، فن میں کمال حاصل ہونا
اہلِ سخن	:	شاعری کرنے والے، شاعر
کلام	:	شاعری، سخن، بات
خلق کرنا	:	تخلیق کرنا، بنانا، پیدا کرنا

معروضی	:	غیر جانب دار، ذاتی پسند و ناپسند کے بغیر، واقعی
دلالت کرنا	:	دلیل دینا، ثبوت یا نشانی پیش کرنا
ترسیل	:	بھیجنا، پہنچانا، ابلاغ
وصف	:	صفت، خصوصیت، خوبی
اسلوب	:	طریقہ، انداز، طور
تجزیہ	:	چیزوں کو الگ الگ کر کے غور سے دیکھنا
مدعا	:	مقصد، غرض، مطلب، منشا، مراد
گوہرِ گوش	:	کان کا آویزہ، موتیوں کا جُھمکا
مماثلت	:	ایک جیسا ہونا، ملتا جلتا، مثل، مانند
معاون	:	مددگار، ساتھ دینے والا، اعانت رنے والا
اجل رسیدہ	:	قریب المرگ، موت کے قریب
سیلی	:	تھپڑ، طمانچہ، ہتھیلی سے منہ پر مارنا
غریب	:	مسافر، اجنبی، بے وطن، مجبور

12.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ درسِ بلاغت : شمس الرحمٰن فاروقی

۲۔ بحر الفصاحت : مولوی نجم الغنی

۳۔ مرأۃ الشعر : عبد الرحمٰن

۴۔ میر کی شعری لسانیات : قاضی افضال حسین

۵۔ شعرِ شور انگیز : شمس الرحمٰن فاروقی

اکائی 13 میرؔ کے شعری امتیازات

ساخت

13.1 اغراض ومقاصد
13.2 تمہید
13.3 میرؔ کے شعری امتیازات
13.3.1 غزل کے شعری امتیازات
13.3.2 مثنوی کے شعری امتیازات
13.3.3 قصیدہ کے شعری امتیازات
13.3.4 دیگر شعری اصناف کے امتیازات
13.3.5 ماحصل
13.4 آپ نے کیا سیکھا؟
13.5 اپنا امتحان خود لیجیے
13.6 سوالوں کے جواب
13.7 فرہنگ
13.8 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میرؔ کی غزلوں کے شعری امتیازات سے واقف ہوں گے۔
- میرؔ کے قصیدوں کے شعری امتیازات سے متعارف ہوں گے۔
- میرؔ کی مثنویوں کے شعری امتیازات سے روشناس ہوں گے۔
- میرؔ کے مرثیوں کے شعری امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- میرؔ کی دیگر اصناف کے شعری امتیازات سے واقف ہوں گے۔

13.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ نے بالتفصیل میر کے کلام کو علم بیان و بدیع کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس

اکائی کے مطالعے سے میر کے ادائے مضمون اور حسن بیان کی انفرادیت، فصاحت و بلاغت کے وسائل اور صنائع و بدائع کے لوازمات سے کلام میر کے محاسن سے واقفیت حاصل کی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں مختلف اصناف شعر کے حوالے سے میر کے شعری امتیازات کو سمجھیں گے۔ یہ تو آپ ضرور جانتے ہیں کہ خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھوں نے اُردو شاعری کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں، جو ان کے شعری شناخت کے امین ہیں۔ لہٰذا اس اکائی میں غزل، قصیدہ مثنوی اور دیگر شعری اصناف کے امتیازات کا آپ مطالعہ کریں گے۔

13.3 میرؔ کے شعری امتیازات

13.3.1 غزل کے شعری امتیازات

میرؔ کو اُردو غزل میں بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ سراجؔ، حاتمؔ، آبروؔ، ناسخؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور مصحفیؔ جیسے اُستاد شعرا نے میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے اوائل عمر ہی میں اپنی شناخت قائم کر لی تھی۔ سوز و گداز، سادگی و سلاست، جذبات کی کسک، صوفیانہ و فلسفیانہ رنگ ان کی غزلوں کے امتیازات قرار پائے۔ یہ حقیقت ہے کہ میر ایک بڑے شاعر اور فن کار ہیں۔ ان کا ذوق شعر فطری تھا۔ درویشوں کی صحبت سے ان کے دِل میں سوز و گداز پیدا ہو گیا اور وہ عشقیہ اور متصوفانہ شاعری کی جانب مائل ہوئے۔ ریختہ میں شعر کہنے سے قبل وہ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ میرؔ کو اپنے مخصوص انداز، منفرد کلام، لَب و لہجہ کی بنا پر ناز تھا:

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میرؔ
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دُھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
سارے عالَم پر ہوں میں چھایا ہوا

جانے کا نہیں شور سخن کا مِرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مِرا دیوان رہے گا

اُردو کی شعری روایت میں میر کی غزلیں موسیقیت، نغمگی اور غنایت کی وجہ سے اپنی انفرادی پہچان رکھتی ہیں۔ ان کی غزلوں کا اہم خاصہ یہ ہے کہ عشقِ حقیقی اور مجازی کے ساتھ ساتھ تصوّف کا رنگ بھی شامل رہا ہے۔

میرؔ کی شاعری کا مرکز و محور عشق ہے۔ان کے یہاں کائنات کا وجود ہی عشق سے ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شعری کائنات عشق کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زُلفوں کے سب اَسیر ہوئے

میرؔ نے عشق کو مختلف زاویوں سے برت کر اپنے گہرے مُشاہدات و تجربات کو نظم کیا ہے۔انھوں نے اختراعی قوت سے عشق کا ایک منفرد پہلو ڈھونڈ نکالا ہے:

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزّت سادات بھی گئی

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دَوا لیتے ہیں

میر کے اشعار میں زندگی کی گہری بصیرت موجود ہے۔ان کے اشعار میں ذاتی تجربات کا بیان آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرتا ہے۔وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار شعر کے پیرایہ میں کرنے کے باوجود وہ آسودہ نہیں ہوتے ہیں:

جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجیے
دردِ دِل ایک غزل میں تو سُنایا نہ گیا

خود داری، عجز وانکساری، حرماں نصیبی، بیزاری، معشوق سے جھگڑا، بے نیازی ان کی غزل گوئی کے بنیادی امتیازات ہیں۔وہ ہمیشہ اپنی ذات میں کائنات کا مشاہدہ نئی طرز اور نئے انداز سے کرتے رہتے ہیں:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کے صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میرؔ کا ہر شعر اپنے معنی و مفاہیم کے لحاظ سے نئی شعری کائنات سے مزّین ہے:

تیری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تُجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کِسو نے

میر کی شعری کائنات کی ایک مخصوص جہت تصوف ہے۔ان کی غزلیں متصوفانہ ماحول میں پروان چڑھی ہیں۔ اس لیے مجازی اور حقیقی عشق کا امتزاج ان کی غزلوں کا امتیاز ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے:

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے
گاہے بکا کرے ہے گاہے دُعا کرے ہے

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

جذبات کی روانی فکر و خیال کا سیل و رواں ،شعری آہنگ اور الفاظ کی دروبست ان کے فن کا امتیاز ہے۔ انھوں نے مشکل زمینوں طویل بحروں اور سخت قافیوں سے پرہیز کیا ہے ان کے یہاں لفظوں کی تکرار سے نئے معنی ومفہوم پیدا ہوئے ہیں اور آہنگ میں وُسعت پیدا ہوئی ہے۔ان کی یہ تکرار اسلوبیاتی شعری خصوصیت بن گئی ہے:

عالَم عالَم عشق جنوں ہے دُنیا دُنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

یہاں دریا دریا اور صحرا صحرا کے استعمال اور تکرار سے ایک مخصوص کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

دِل تڑپتے ہے جان گُھلے ہے حالِ جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں مجنوں کیا ہم سا ہو گا

میر کا یہ آرٹ اور فنّی امتیاز ہے کہ وہ روز مرہ الفاظ کے انتخاب اور تکرار الفاظ سے نئے پہلوؤں کو ابھارنے کا خدا داد ملکہ رکھتے ہیں، درج ذیل اشعار میں ان کی فنّی حِسّیت دیکھیے :

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میؔر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

میر کی غزلوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں سہل بیانی بہت ہے،لیکن اس سہل ممتنع میں عام معنی کے بجائے شعر میں ایک جہان معنی آباد ہوتا ہے، جہاں غور وخوض کے بعد ہی پہنچا جا سکتا ہے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

نازکی اس کے لَب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گُلاب کی سی ہے

مذکورہ اشعار میں میر کی سادہ اور سہل بیانی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ میر کی عظمت کا ایک بڑا سبب زبان کے ماہرانہ استعمال اور اندازِ بیان کی تازگی ہے۔ ظاہری طور پر میر کے اشعار اگر چہ عام اور سادہ معلوم ہوتے ہیں اور لگتا ہے کہ میر نے بغیر کسی کاوش کے ایک کیفیت یا صورتِ حال کو اپنے جذباتی ردّعمل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ جب کہ میر کے کلام میں زبان اور تراکیب کی سادگی اہلِ فن کو آج بھی دھوکہ دیتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ایسی سادہ اور عام سی زبان میں تو وہ خود بھی شعر کہہ سکتے ہیں لیکن جب کہنے بیٹھتے ہیں تو یہی سادگی ان کے لیے سب سے بڑی مشکل ثابت ہوتی ہے۔ یہ سہلِ ممتنع میر کا اعجاز ہے۔

انھوں نے زندگی اور فکر و فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کو اس قدر آسان کر کے بیان کیا ہے کہ کسی دوسرے شاعر کو یہ فن میسر نہیں۔ ان کا لب و لہجہ منفرد اور مختلف ہے جس میں حکیمانہ، دانشورانہ، متصوفانہ اور عارفانہ پہلو یکجا ہو گئے ہیں:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سَر دُھنیے گا

احساس و اِدراک شدّت، المیہ اور نفسیاتی کیفیات وارادت قلبی کا بیان بھی میرؔ کے شعری امتیازات کا جز ہے:

کہا میں نے گُل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسُّم کیا

میرؔ کی غزلوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے حسب موقع ہندی لفظیات اور محاوروں کو احسن طریقے سے استعمال کیا ہے مثلاً: نین، تجھ بن، داتا، ساجن وغیرہ کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ اسی طرح میر نے فارسی لفظیات اور محاوروں کے اردو ترجمے سے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح ان کی ابتدائی غزلوں میں فارسی تراکیب اور فارسی مرکبات کا استعمال خوب نظر آتا ہے، لیکن بعد میں رفتہ رفتہ یہ تراکیب اور مرکبات کی آمیزش ان کی غزلوں سے کم ہوتی چلی گئی۔ بہر کیف میر کا کلام لسانی خصوصیات اور زبان دانی کے فنی امتیازات سے آراستہ

نظر آتا ہے۔ان کی فصاحت ان کے شعری اسلوب میں پنہا ہے۔خوش بیانی میرؔ کا مخصوص اسلوب ہے۔میرؔ کے کلام میں شوخی، امیجری اور زبان و بیان کا سیل رواں بدرجۂ اتم ہے۔ان کا تخلیقی عمل بہت موثر ہے۔ان کی غزلیں عام اور سادہ ہوتے ہوئے بھی عام نہیں ہیں۔الغرض یہ کہ حُسن وعشق کی واردات اور کیفیات قلبیہ کا ذکر، حقیقی ومجازی نفسیات، ندرتِ بیان، سادہ اسلوب فکر و بیان، آلام ومصائب کے تلخ تجربات، متصوفانہ اظہار، تخیل کی بلندی، موسیقی اور مترنم بحروں کا استعمال، معنی اور مضمون آفرینی، نادر استعارے اور نازک تشبیہیں، نئی تراکیب، صاف گوئی اور بے باکی وغیرہ میر کی غزلوں کے نمایاں امتیازات ہیں۔

13.3.2 مثنوی کے شعری امتیازات

غزل کے بعد میرؔ نے صِنفِ مثنوی میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔میرؔ کی تقریباً تین درجن مثنویاں ادب کا سرمایہ ہیں۔انھوں نے اس فن کو امتیاز بخشا اور ہئیت کے نئے تجربے کیے۔انھوں نے سوانحی نوعیت کی مثنویاں بھی لکھیں اور عشقیہ زندگی پر مبنی مثنویاں بھی تحریر کیں۔جنسی اور رومانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی بیان کیا۔ان کی مثنویوں میں سماجی اور تہذیبی رنگ بھی ملتا ہے۔انھوں نے خوشی اور خصوصاً شادی کے موقعوں پر بھی مثنویاں لکھی ہیں۔غرض یہ کہ ان کی مثنویوں کے موضوعات عشقیہ ہونے کے علاوہ تہذیبی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقیات کو محیط ہیں۔انھوں نے تقریباً تمام پہلوؤں کو اپنی مثنویوں کا موضوع بنایا۔یہاں تک کہ انہوں نے ایک مثنوی اپنے گھر کی ہجو میں بھی لکھی ہے۔جمیل جالبی نے میرؔ کی مثنویوں کے چار عنوان قائم کیے ہیں۔اول عشقیہ، دوم واقعاتی، سوم مدحیہ، چہارم ہجویہ۔دریائے عشق، شعلۂ عشق، اعجاز عشق اور معاملات عشق اہم مثنویاں ہیں اس کے علاوہ خواب وخیال، درجشن ہولی وکتخدائی، شکارنامہ، جنگ نامہ، درہجو نااہل مسمّٰی بہ زبان زد عالم اور ساقی نامہ بھی مشہور ہیں۔دریائے عشق کو بہت شہرت ملی یہ میرؔ کی اہم اور نمائندہ مثنویوں میں سے ایک ہے۔ان کی نمائندہ مثنویوں کے امتیازات درج ذیل ہیں۔

ان کی مثنویوں کا ایک امتیاز یہ ہے کہ مثنوی میں کردار زیادہ نہیں ہوتے ہیں، عموماً ایک مرکزی کردار ہیروں کی شکل میں ہوتا ہے۔دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ان کی مثنویوں میں غزل کا احساس ہوتا ہے۔تیسرا امتیاز یہ ہے کہ ان کی بیشتر مثنویاں المیہ ہیں۔سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ ''میر کے ذہن کو المیہ تصورات سے بڑی دلچسپی تھی ان کے نزدیک عشق اور ٹریجڈی لازم وملزوم ہیں''۔یعنی ان کی مثنویوں کا انجام کار المیہ ہوتا ہے۔ان کی مثنویوں کا محور عشق وعاشق کے مابین قائم رہتا ہے۔

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

میرؔ نے ''ذکر میر'' میں اپنے والد کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کائنات کا نظام عشق پر منحصر ہے۔

دنیا میں یہ حرکت و عمل عشق ہی کے باعث ہے۔ جس کی بازگشت ان کی مثنویوں میں محسوس کی جاسکتی ہے:

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اِک نئی ہے چال

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سَر میں جنون ہو کے بہا

کہیں عُشاق کا نیاز ہوا
کہیں اندوہ جاں گداز ہوا

(مثنوی دریائے عشق)

واسطے جس کے تھا میں آوارہ
ہاتھ آئی مِرے وہ ماہ پارہ

(مثنوی معاملات عشق)

جہاں میں فریب ان کا مشہور ہے
زباں پر مگر ان کا مذکور ہے

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

(مثنوی شعلۂ عشق)

ان کی مثنویوں میں جگ بیتی کا انداز نمایاں ہے۔ جس میں جذبات نگاری انتہائی موثر ہے۔ انھوں نے جذبے اور دلی کیفیات پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ وہ اپنی مثنویوں میں قصہ کو قلب کا درجہ دے کر واردات عشق کو موضوع سخن کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ قصہ نویس کم بلکہ عشق کے ترجمان زیادہ بن کر سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی مثنویاں جذبات و احساسات کا آئینہ خانہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی وہ مثنویاں جن کا تعلق عشق سے ہے ان میں جان کا نذرانہ موجود ہے یعنی عاشق کی موت پر معشوق یا معشوق کی موت پر عاشق جان دینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ بالعموم وہ جذبۂ عشق کی تاثیر کو واضح کرنے کے لیے لاشوں کو بھی اس قدر واصل کر دیتے ہیں کہ انھیں جدا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ان کی مثنویوں کا خاصہ عشق کے پردے میں مقصد حیات کو پیش کرنا ہے اور معاشرے کو یہ اخلاقی سبق دینا ہے کہ مقاصد کی حصولیابی میں جان دینا انسانیت کی معراج ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں ان کی مثنویوں میں مطلق عشق کا تصور ملتا ہے، جو تمام زندگی اور کائنات پر غالب ہے۔ عشق کے المیہ کو بیان

کرنے کے لیے وہ کوئی حکایت یا واقعہ کا انتخاب کر کے عشق کی دل سوزی کو برقرار رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پہلے مصرعہ میں جو فضا بناتے ہیں وہ آخر تک قائم رہتی ہے۔ ان کے یہاں قصے کے بیان کے بجائے دل کی واردات و کیفیات کا بیان حاوی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی مثنویوں کے اشعار غزل کے مطلعوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل وہ مثنوی کی ہیئت میں اپنے ہی درد و غم کو سناتے چلے جاتے ہیں۔

13.3.3 قصیدہ کے شعری امتیازات

میر نے صنف قصیدہ گوئی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن قادرالکلام شاعر ہونے کے باوجود سوداؔ اور ذوقؔ کی طرح میر کے قصیدوں میں زورِ بیان موجود نہیں ہے۔ انھوں نے قصیدہ کے فن میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں 'قصیدہ در مدح نواب آصف الدولہ بہادر' جو شخصی نوعیت کا قصیدہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی دو قصیدے اور بھی کلیات میں موجود ہیں۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش ہیں:

ہوا کیے ہیں ز بس شکوۂ فلک تحریر
سیہ ہے کاغذِ مشقی کے رنگِ لوحِ ضمیر

کروں نہ شکر جفا ہائے آسماں کیوں کر
مِری خرابی میں ان نے نہ کی کچھ تقصیر

قصیدہ مدحیہ 'شاہ وقت' سے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

جو پہنچی قیامت تو آہ و فغاں ہے
مرے ہاتھ میں دامنِ آسماں ہے

جو روتا بھی ہوں میں غُبارِ دلی سے
تو آنسو کا سیلاب ریگِ رواں ہے

میر کے قصیدوں میں صنفی محاسن کی بہت کمی ہے۔ سودا کے مقابلے میں ان کے قصائد پست ہیں۔ تشبیب اور مدح میں علوے فکر اور زور بیان کی بہت کمی محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن ہاں ان کے قصائد میں عام طور سے محاکات اور تخیل آفرینی بڑی کثرت سے پائی جاتی ہے، جس کی بہترین مثال منقبت حضرت علی کی تشبیب میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی طرح ممدوح کی خاطر خواہ شجاعت، بہادری، عدل، انصاف، فیوض اور برکات وغیرہ کا بیان قدرے عمدہ ہے۔ بالخصوص انھوں نے شجاعت اور بہادری کی تعریف پر اپنا زیادہ زور صرف کیا ہے۔ لیکن بحثیت مجموعی مدح نگاری میں فکر و فن کی ناہمواری موجود ہے۔ گریز اور عرض مطلب میں سیدھا سادہ طرز بیان ملتا ہے۔ یہاں

بھی ان کی فکری کاوشوں کا فقدان نظر آتا ہے۔ الغرض یہ کہ انھیں صنف قصیدہ سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔

13.3.4 دیگر شعری اصناف کے امتیازات

میرؔ کی مرثیہ نگاری :

غزل اور مثنوی کے علاوہ میرؔ نے مرثیہ، رُباعی، قصیدہ، واسوخت، ہجو اور شہر آشوب کی ہیئت میں سوانحات بھی لکھیں ہیں۔ میرؔ نے ۲۴ مرثیے اور سات سلام بھی لکھے ہیں۔ میرؔ نے صنف مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ان کی طبیعت مرثیہ نگاری کے لیے موزوں تھی۔ میرؔ نے مرثیہ کے فن اور روایت کو فروغ دیا۔ اور سماجی وثقافتی نقطۂ نظر سے مرثیہ کے فن میں اضافہ کیا۔ میرؔ نے انسانی جذبے اور اہل کربلا کی عظمت اور ان کے مصائب کو محسوس کیا اور اسے اپنے مرثیوں میں فن کارانہ انداز میں پیش کیا۔ مسیح الزماں نے 'مجموعۂ مراثی' میں بہترین انتخاب پیش کیا ہے:

یک چند خدا جا کے وہ رنجور رہے گا
بے گور و کفن یہ تن پر نور رہے گا

ہر جائے بہم تیرے مذکور رہے گا
کیا سمجھے تھے وے لوگ جو یہ بے ادبی کا

بحیثیت مرثیہ گو میرؔ کا رُتبہ بلند ہے۔

رُباعیاتِ میر:

میرؔ نے رُباعیات میں بھی اپنے فکر وفن کا اظہار کیا ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ فکر وخیال اور حکیمانہ دانش سے پُر مضامین ملتے ہیں۔ میرؔ نے سَوا سَو (۱۲۵) رُباعیات لکھیں ہیں۔ انہوں نے تصوّف کے مضامین کو بھی شامل کیا ہے۔ میرؔ کی چند رُباعیات مثال کے طور پر پیش ہیں:

ہم میرؔ سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر
ہنس کھیل کے ٹک چین سے سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ در نایاب
کُڑھ کُڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

کیا تجھے جان ہوئی تھی بھاری
جو اس بتِ سنگدل سے کی تھی یاری

بیمار بَھلا کیا کوئی ہولے اس کا
پرہیز کرے اس سے خدائی ساری

ہر صبح میرے سَر پہ قیامت گزری
ہر شام نئی ایک مصیبت گزری
پامال کدورت ہی رہا یاں دن رات
یوں خاک میں ملتے ہم کو مدّت گزری

میؔر کی واسوخت :

میؔر کو واسوخت کا موجد کہا جاتا ہے۔ اگر چہ اس قسم کی نظموں کے نمونے ان سے پہلے شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔ میؔر کو اس فن پر دسترس تھی یہ فن بھی میؔر کے شعری امتیازات میں شامل ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر درج ہیں:

سچ کہو شہر میں صحرا میں کہاں رہتے ہو
یاں بہت رہتے ہو خوش باش کہ واں رہتے ہو

ان دنوں یاروں کی آنکھوں سے نہا رہتے ہو
خوش رہو میؔر میری جاں کہاں رہتے ہو

واسوخت کو برسوں تک ایک فن کے طور پر برتا گیا اور ایک عرصہ تک اس کی مقبولیت بھی رہی واسوخت میں شاعر محبوب سے ناراض ہو کر جلی کٹی سُناتا ہے :

پیار تجھ کو نہ کیا کرتے اگر جانتے ہم
کاش کہ تیری روش پہلے ہی پہچانتے ہم

جھوٹے جھوٹے ترے وعدے نہ کبھو مانتے ہم
جی میں ٹھانی ہے جو کچھ سو تبھی ٹھانتے ہم

ہجویات میؔر :

ہجو میں ذاتی، مجموعی یا سماجی خرابیوں کو ظاہر کرنا ہے۔ ارکان حکومت کی خامیوں اور غلط رسم و رواج پر اعتراض اور ان کی طرف نشان دہی کرنا ہے۔ میؔر کی ہجویات میں اختلاف، مخالفت یا تضحیک کا پہلو ہرگز نہیں ہے۔ میؔر کے یہاں ہجویات میں سوقیت بھی نہیں ہے بلکہ معلومات کا سیل رواں ہے۔ البتہ ہجو میں طنز کا پہلو لازمی ہے۔ کیوں کہ طنز کرنے والا ایک سوختہ اور پرسوز دل رکھتا ہے۔ میؔر کو اس فن پر بھی مہارت حاصل تھی، کیوں کہ وہ زمانہ کی آنچ میں تپ کر آئے تھے اور دوسروں کو بھی اس کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ میؔر نے مخمس کی شکل میں ہجو کہی

ہیں۔مثلاً مخمس درہجو لشکر، درہجو خواجہ سرائے،مثنوی درہجو خانہ خود کے علاوہ بھی میرؔ نے ہجو کہی ہیں:

جس کسو کو خدا کرے گمراہ آوے لشکر میں رکھ اُمید وفا
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ جس کو دیکھو سو ہے بحالِ تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکھٹے آہ

(مخمس درہجو لشکر)

نعت ومنقبت،قطعات اورسوانحات میرؔ کی شعری کائنات اورفنی امتیازات میں شامل ہیں۔میرؔ کا شعری کینوس بہت وسیع اور ہمہ جہت ہے۔

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

خدائے سخن میرتقی میرؔ کواُردو کی شعری تاریخ میں استناد کا درجہ حاصل ہے۔

13.3.5 ماحصل

میرؔ کواُردو کا مستند اُستاد تسلیم کیا جاتا ہے۔اُردو کے ہر بڑے شاعر نے ان کی شعری عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ غالبؔ،ذوقؔ،سوداؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، حیرتؔ اور یاس یگانہؔ نے بھی میرؔ کے انداز اورفن کو استناد کا درجہ دیا ہے۔'خدائے سخن' میرؔ نے خود بھی کہا ہے''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''سبھی شعرا نے ان کے استناد کو بڑے احترام سے تسلیم بھی کیا ہے۔عشق ان کی شاعری کا مرکز ومحور رہا۔وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ان کے یہاں تصوف اور عشق کا رنگ نظر آتا ہے۔ان کے یہاں رنج وغم کا احساس زیادہ ہے۔سادہ اور سہل بیانی ان کی شاعری کا وَصف خاص ہے۔لفظوں کی تکرار' صاف گوئی' موسیقیت' مترنم بحریں،احساس وادراک،نفسیاتی کیفیات واردات قلبی کا بیان ان کے شعری امتیازات ہیں۔

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کے شعری زبان وبیان سے واقفیت حاصل کی۔
- میرؔ کی شعری خُصوصیات سے آگہی حاصل کی۔
- میرؔ کے فکری وفنی کمالات کا ادراک کیا۔
- میرؔ کے شعری امتیازات کی معلومات حاصل کی۔

- میرؔ کے مقام و مرتبہ اور شعری عظمت کی جانکاری حاصل کی۔

13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میرؔ کی غزلوں کے شعری امتیازات کو مختصراً بیان کیجیے۔

۲۔ شاعرانہ تعلّی پر مبنی میر کے کسی ایک شعر کو تحریر کیجیے۔

۳۔ میرؔ کی مثنوی کے متعلق اپنی معلومات کو مختصراً قلم بند کیجیے۔

۴۔ میرؔ کی قصیدہ نگاری پر ایک مجمل نوٹ لکھیے۔

۵۔ میرؔ کی کسی ایک رباعی کو نقل کیجیے۔

13.6 سوالوں کے جواب

۱۔ حُسن و عشق کی واردات اور کیفیات قلبیہ کا ذکر، حقیقی و مجازی نفسیات، سوز و گداز، سادگی و سلاست، جذبات کی کسک، زندگی کی گہری بصیرت، عجز و انکساری، حرماں نصیبی، بیزاری، جذبات کی روانی، فکر و خیال کی اثر انگیزی، آپ بیتی کو جگ بیتی بنانا، خود داری، شاعرانہ تعلّی، شعری آہنگ، الفاظ کی خوبصورت دروبست، لفظوں کی تکرار سے نئے معنی و مفہوم وضع کرنا، صوتی آہنگ، موسیقیت، نغمگی اور غنایت، لَب و لہجہ میں نرمی، حسب موقع ہندی لفظیات اور محاوروں کا برمحل استعمال، خوش بیانی، ندرتِ بیان، مترنم بحروں کا استعمال، معنی اور مضمون آفرینی، نادر استعارے اور نازک تشبیہیں، نئی تراکیب، صاف گوئی اور بے باکی وغیرہ میر کی غزلوں کے نمایاں شعری امتیازات ہیں۔

۲۔ شاعرانہ تعلّی پر مبنی میر کا شعر درج ذیل ہے:

جانے کا نہیں شور سخن کا مِرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مِرا دیوان رہے گا

۳۔ میرؔ کی تقریباً تین درجن مثنویاں ادب کا سرمایہ ہیں۔ انھوں نے سوانحی نوعیت کی مثنویاں بھی لکھیں اور عشقیہ زندگی پر مبنی مثنویاں بھی تحریر کیں۔ ان کی مثنویوں میں سماجی اور تہذیبی رنگ بھی ملتا ہے۔ انھوں نے خوشی اور خصوصاً شادی کے موقعوں پر بھی مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کی مثنویوں کے موضوعات عشقیہ ہونے کے علاوہ تہذیبی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقیات کو محیط ہیں۔ اول عشقیہ، دوم واقعاتی، سوم مدحیہ، چہارم ہجویہ۔ دریائے عشق، شعلۂ عشق، اعجاز عشق اور معاملات عشق ان کی اہم مثنویاں ہیں۔ اس کے علاوہ خواب وخیال، درجشن ہولی و کتخدائی، شکارنامہ، جنگ نامہ، درہجو نا اہل مسمیٰ بہ زبان زد

عالم اور ساقی نامہ بھی مشہور ہیں۔ دریائے عشق کو بہت شہرت ملی یہ میؔر کی اہم اور نمائندہ مثنویوں میں سے ایک ہے۔

۴۔ میر نے چند قصیدے بھی کہے۔لیکن قادرالکلام شاعر ہونے کے باوجود سوؔدا اور ذوقؔ کی طرح میر کے قصیدوں میں زورِ بیان موجود نہیں ہے۔ان کے قصیدوں میں صنفی محاسن کی بہت کمی ہے۔سودا کے مقابلے میں ان کے قصائد پست ہیں۔تشبیب اور مدح میں علوے فکر اور زور بیان کی بہت کمی محسوس کی جاتی ہے۔لیکن ہاں ان کے قصائد میں عام طور سے محاکات اور تخیل آفرینی بڑی کثرت سے پائی جاتی ہے،جس کی بہترین مثال منقبت حضرت علی کی تشبیب میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اسی طرح ممدوح کی خاطر خواہ شجاعت، بہادری،عدل، انصاف، فیوض اور برکات وغیرہ کا بیان قدرے عمدہ ہے۔ بالخصوص انھوں نے شجاعت اور بہادری کی تعریف پر اپنا زیادہ زور صرف کیا ہے۔لیکن بحیثیت مجموعی مدح نگاری میں فکروفن کی ناہمواری موجود ہے۔گریز اور عرض مطلب میں سیدھا سادہ طرز بیان ملتا ہے۔ یہاں بھی ان کی فکری کاوشوں کا فقدان نظر آتا ہے۔الغرض یہ کہ انھیں صنف قصیدہ سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔

۵۔ میؔر کی رباعی درج ذیل ہے:

ہر صبح میرے سَر پہ قیامت گزری
ہر شام نئی ایک مصیبت گزری
پامال کدورت ہی رہا یاں دن رات
یوں خاک میں ملتے ہم کو مدّت گزری

13.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
قادرالکلام	:	کلام پر قدرت رکھنے والا
آسودگی	:	خوشحالی
سیراسیمگی	:	حیرانی،تحیّر
آشوب	:	فِتنہ
اختراع	:	ایجاد،نئی بات پیدا کرنا

رنجور	:	غم سے بھرا ہوا
واسوخت	:	وہ نظم جس میں محبوب سے اظہار بیزاری ہو
موجد	:	ایجاد کرنے والا
تقلید	:	پیروی
مستند	:	اعتبار حاصل ہوا
خوش رو	:	خوبصورت چہرہ والا

13.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔	میر اور میریات	:	صفدر آہ
۲۔	میر تقی میر حیات اور شاعری	:	خواجہ احمد فاروقی
۳۔	مثنویات میر	:	سید محمود
۴۔	مراثی میر	:	مسیح الزماں
۵۔	محمد تقی میر	:	جمیل جالبی
۶۔	غزلیات میر کی اسلوبیات	:	شاہد پرویز

اکائی 14 میرؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم

ساخت

14.1 اغراض ومقاصد

14.2 تمہید

14.3 میرؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم

14.3.1 منتخب متن کی تدریس و تفہیم

(۱) کئی دن سلوک وداع کا مرے دل پہ دل زار تھا

(۲) آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا

(۳) کیا میں بھی پریشانی خاطر سے قریں تھا

(۴) پائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا

(۵) کیا مصیبت زدہ دل مائل آزار نہ تھا

14.3.2 ماحصل

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

14.6 سوالوں کے جواب

14.7 فرہنگ

14.8 کتب برائے مطالعہ

14.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میرؔ کی غزلوں کے موضوع و مضامین سے واقف ہوں گے۔
- میرؔ کی غزلوں کے فکر اور فن سے روشناس ہوں گے۔
- میرؔ کی غزلوں کے شعری امتیازات سے متعارف ہوں گے۔
- میرؔ کی غزلوں کے مقام و مرتبہ کو جانیں گے۔

- شامل نصاب پانچ غزلوں کی قرأت اور اس کی تشریحات سے متعارف ہوں گے۔

14.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میر کے شعری امتیازات کو غزل، مثنوی، قصیدہ اور دیگر شعری اصناف کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس مطالعے کے دوران آپ کو میر کے اختصاص شعر اور ان کے کلام کے لسانی خواص سے آگہی حاصل ہوئی ہوگی۔ اب آپ کی زیرِ نظر یہ اکائی میر کی شامل نصاب ردیف ''الف'' کی پانچ غزلوں کی تشریحات سے متعلق ہے۔ جس میں آپ میرؔ کے اشعار کے معنی ومطالب پر غور کریں گے اور ان سے ماخوذ خیالات کی روشنی میں میر کی فکری وفنی ترجیحات کو سمجھیں گے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ شعر اپنے باطن میں متعدد معنی ومفہوم پوشیدہ رکھتا ہے لیکن نصابی غزلوں کی تشریحات میں آسانی کے مدنظر شعر کے بنیادی خیال کی وضاحت ہی کی جاتی ہے، تاکہ فن پارے کی حقیقی روح کو سمجھا جاسکے۔ لہٰذا یہاں آسان اور عام فہم زبان میں میر کی شامل نصاب غزلوں کی تفہیم سیاق وسباق کے ساتھ پیش کی جائے گی۔ امید ہے آپ اس سے مستفید ہوں گے۔

14.3 میرؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

14.3.1 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

میر کی شامل غزلوں کی قرأت اور اس کی توضیحات سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ میر بنیادی طور پر واردات قلبیہ کے غزل گو شاعر ہیں ۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں داخلی اور خارجی واردات کی دھڑکنوں کو خلوص، صداقت، سادگی اور سوز وگداز کے ساتھ پیش کیا ہے، جس میں تفکر، سرور، توازن اور ٹھہراؤ وغیرہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کا شیوۂ سخن دنیا کی بے ثباتی ، اعلی انسانی اقدار اور اخلاقی معاملات و مسائل کو محیط ہے۔ وہ اپنے موضوعات کو شعری پیکر میں اس خوبصورتی سے تراشتے ہیں کہ تمام حالتوں میں فنّی التزام اور بے تکلفی غالب رہتی ہے۔ طرزِ سخن میں غنائیت اور موسیقیت اور فنّی دلکشی کا مخصوص دخل ہے۔ آپ جملہ خصوصیات کا بہ خوبی اندازہ شامل نصاب غزلوں کے متن سے لگا سکتے ہیں۔

عزیز طلبا! آئیے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب پہلی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۱)

کئی دن سلوک وداع کا مرے درپے دل زار تھا
کبھو درد تھا کبھو داغ تھا کبھو زخم تھا کبھو وار تھا

دم صبح بزم خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سوتو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دل خستہ لوہو جو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا کبھو درد وغم سے فگار تھا

جو نگاہ کی بھی پلک اٹھا تو ہمارے دل سے لہو بہا
کہ وہیں وہ ناوک بے خطا کسو کے کلیجے کے پار تھا

یہ تمہاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکا
وہی آفت دل عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی یہ درد تھا یہی خستگی
اسے جب سے ذوقِ شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

کبھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا ترے باغ تازہ میں خار تھا

عزیز طلبا! مذکورہ شامل نصاب غزل میرؔ کے دیوان اول سے مختص ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر آٹھ اشعار پر مشتمل ہے، لیکن یہاں آپ کے نصاب میں محض سات اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ جس کے قوافی ''زار، وار، غبار، فگار، پار، یار، سروکار اور خار'' ہیں اور اس کی ردیف ''تھا'' ہے۔ غزل کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

کئی دن سلوک وداع کا مرے درپے دل زار تھا
کبھو درد تھا کبھو داغ تھا کبھو زخم تھا کبھو وار تھا

اس شعر میں عاشق محبوب سے جدائی کا زمانہ یاد کرتے ہوئے اپنے مصیبت زدہ دل کی کیفیت کو بیان کرتا ہے، کہ اس دل میں پہلے تو خوف جدائی کا درد تھا، اس کے بعد جدائی نے زخم دیا، ایسا زخم دیا جو خشک ہو کر داغ کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ یہ شعر بنیادی طور پر عاشق کی قلبی کیفیت کا ترجمان ہے اور پے درپے سلسلۂ غم کے مراحل بیان کرتا ہے۔ اس شعر میں لفظِ وداع کی نسبت کو زمان، مکان اور فرد کی جانب موڑ کر مختلف معانی کا ادراک کر سکتے ہیں۔ مثلاً زمان کی طرف نسبت کریں تو اس سے مراد ہوگی کہ میرؔ اپنے زمانۂ امن اور خوشحالی کو یاد کر رہے ہیں۔ اگر مکان کی طرف نسبت کریں تو اس کا مطلب ہوگا کہ وطن کی جدائی میں دل شکستہ ہے اور اگر فرد کی طرف نسبت کریں تب اس کا مفہوم محبوب سے ہجر کا پتہ دیتا ہے۔ اس شعر میں صنعت تناسب ملحوظ ہے۔

دم صبح بزم خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

متکلم اس شعر میں کہتا ہے کہ جب انسان مسلسل درد والم میں مبتلا رہتا ہے تو اس کی نظر میں شب وروز کا فرق نہیں

رہتا ہے اور اس کے حق میں ساری ساعتیں بلا کسی تفریق کے مساوی ہو جاتی ہیں، پھر کیا رات کیا دن۔ ایک مستقل پریشان حال نظر میں خوشی اور غم، چراغ اور دھواں، پتنگ اور غبار سب ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں۔

دل خستہ لوہو جو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا کبھو درد و غم سے فگار تھا

مذکورہ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دل جو پریشان تھا بالآخر لوہو یعنی خون خون ہو گیا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ کیوں کہ دل کبھی سوز سے داغ ہو جاتا تھا اور کبھی آتش غم میں جلتا رہتا تھا۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ دل اپنے انتہائی جذبے یعنی لہو کی شکل میں بدل گیا، اب اس پر دکھ و درد کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا ہے۔ عزیز طلبا! اس شعر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میرؔ کا غم مایوس کن نہیں بلکہ نشاط بخش ہے۔

جو نگاہ کی بھی پلک اٹھا تو ہمارے دل سے لہو بہا
کہ وہیں وہ ناوک بے خطا کسو کے کلیجے کے پار تھا

طلبائے عزیز! میرؔ نے درج بالا شعر میں معشوق کی خاص ادا کو بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کر دیا ہے کہ متکلم کہتا ہے کہ جب بھی معشوق نے دیکھنے کے لیے نگاہ اٹھائی تو اس سے پہلے پلکیں اٹھائیں، یہ پلکیں کسی ناوک یعنی تیر سے کم نہیں ہیں، جو دل کو لہولہان کر دیتی ہیں اور بغیر کسی خطا کے عاشق کا دل زخمی کر دیتی ہیں۔

یہ تمہاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکا
وہی آفت دل عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

میرؔ ایک غمزدہ عاشق کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم ان دنوں جس کے غم میں مبتلا ہو اور گریہ وزاری کر رہے ہو اس نے تم سے قبل مجھ سے بھی فریب دہی کا ڈھونگ رچ کر ہم کو بھی غم عشق میں مبتلا کیا تھا اور پھر ہم سے بے وفا ہو کر دوسرے احباب کو گرفتار عشق کیا تھا۔ اگر اس شعر میں آفت کی نسبت محبوب کے بجائے دنیا کی جانب کی جائے تو اس کے مفہوم میں مزید وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کے ہنگامی حالات آلام و مصائب کا سبب بنتے ہیں جن سے انسان کا حساس دل متاثر ہوتا ہے اور وہ بے تاب ہو کر ماضی کی خوش حالیوں پر اشک بہاتا ہے۔

نہیں تازہ دل کی شکستگی یہ درد تھا یہی خستگی
اسے جب سے ذوق شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

اس شعر میں میرؔ روشِ معشوق اور دلِ عاشق کی فطرت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ معشوق اور دل کا رشتہ ازلی اور ابدی ہے۔ معشوق کی فطرت یہ ہے کہ اسے ذوق شکار رہتا ہے اور دل کی فطری صفت یہ ہے کہ وہ زخم کھانے کا متلاشی رہتا ہے۔ گویا دونوں اپنی اپنی فطرت سے لاچار و مجبور ہیں۔

کبھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرؔ شکستہ پا ترے باغ تازہ میں خار تھا

میر اس شعر میں بادصبا سے کہتے ہیں کہ اگر میرے محبوب کی گلی سے تمہارا گزر ہو تو کہنا کہ جو تمہارے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا تھا وہ میرؔ اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب دوسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۲)

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا ‏ عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے ‏ چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے ‏ ہشیار زینہار خبردار دیکھنا
بلبل ہمارے گل پہ نہ گستاخ کر نظر ‏ ہوجائے گا گلے کا کہیں ہار دیکھنا

اس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میرؔ
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

عزیز طلبا! مذکورہ شامل نصاب غزل میرؔ کے دیوان اول سے مختص ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر دس اشعار پر مشتمل ہے، لیکن محض پانچ شعروں کو آپ کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ جس کے قوافی ''یار، دیدار، دیوار، خبر دار، ہار اور آزار'' ہیں اور اس کی ردیف ''دیکھنا'' ہے۔ غزل کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

درج بالا شعر میں متکلم اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ یہ میرا وقتِ آخر ہے اگر تم میری طرف اپنا منہ کر لو تو میں آخری بار تم کو دیکھ لوں اور سکون سے جان دے سکوں۔ دوسرا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ مرنے والا موت کے کرب میں مبتلا ہے، وہ موت اور زندگی کے ایسے درمیانی مرحلے میں ہے جہاں موت زندگی کا خاتمہ نہیں کر سکتی اور زندگی موت کو شکست نہیں دے سکتی۔ گویا مرنے والے کو ایسے سہارے کی ضرورت ہے جس سے اس کی موت

واقع ہو جائے یا اس کو زندگی مل جائے۔ یہ سہارا معشوق کی معمولی توجہ میں مضمر ہے، لیکن معشوق بہت سنگ دل ہے جو اپنے عاشق کو اسی کرب میں دیکھنے کا قائل ہے۔

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

میرؔ اس شعر میں کہتے ہیں کہ یہ کیسا چمن ہے اور ہماری کیسی مجبوری ہے کہ قفس کی دو تیلیوں کے درمیاں کھلا ہوا حصہ تو ہے جس سے باغِ دیوار بھی نظر آتی ہے، اور دیوار کے پس پشت آزادی ہے، لیکن افسوس یہ قفس محض آزادی کے نام پر ایسا فریب ہے جس میں صرف زندہ ہی رہا جاسکتا ہے، زندگی کا جشن نہیں منایا جاسکتا ہے۔ گویا زندگی گزارنے کے لیے مکمل آزادی پہلی شرط ہے۔

ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے
ہشیار زینہار خبردار دیکھنا

درج بالا شعر میں میرؔ اپنے دل کو بڑی سادگی اور معصومیت سے مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے دل! اس انسان سے معاملات روا رکھنا کجا نظریں بھی مت ملانا کیوں کہ یہ انسان یا معشوق اپنی نگاہوں سے ہی تمہارے دل میں جگہ بنا لے گا اور تمہارے دل کو اپنے تئیں موم کر لے گا، کیوں کہ اس کا پیشہ ہی نظریں ملا کر بے قرار کرنا اور غلام بنانا ہے۔ اس لیے اس کی نظروں سے ہوشیار اور خبردار رہنا۔

بلبل ہمارے گل پہ نہ گستاخ کر نظر
ہو جائے گا گلے کا کہیں ہار دیکھنا

میرؔ بلبل سے کہتے ہیں کہ اے رقیب ہمارے محبوب پر نظر نہ ڈالنا، جو نہایت ہی دلکش اور پر خطر ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری جان جانے کا باعث بن جائے۔

اس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میرؔ
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

میرؔ کہتے ہیں کہ حسینوں کی خوبصورت آنکھیں دیکھ کر ان پر فریفتہ نہ ہو جانا اور ان کے عشق میں مبتلا نہ ہو جانا، کیوں کہ عشق میں جدائی انسان کا دم نکال دیا کرتی ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب تیسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۳)

کیا میں بھی پریشانی خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہیں تھا
کس رات نظر کی ہے سوے چشمک انجم — آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہ جبیں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن — ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسیں تھا
اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ — جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا
جانا نہیں کچھ جز غزل آ کر کے جہاں میں — کل میرے تصرف میں یہی قطعۂ زمیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا — جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

عزیز طلبا! زیر مطالعہ غزل میرؔ کے دیوان اول سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور سے سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اس غزل کے قوافی ''قریں، کہیں، جبیں، ، پسیں، وہیں، زمیں، نگیں اور نشیں'' ہیں اور ردیف ''تھا'' ہے۔ جس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

کیا میں بھی پریشانی خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہیں تھا

اس مطلع میں میرؔ اپنے درد وغم کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے میرا ذہن ودل پریشانی وبدحالی میں مبتلا ہو گیا ہے، کیوں کہ میری زندگی کی شکستہ حالی، تنگ دستی وبدحالی، غریب الوطنی اور عشق کی ناکامی نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ آنکھوں کا کوئی اور تصور ہے اور دل میں کسی اور کا غم سمایا ہوا ہے۔

کس رات نظر کی ہے سوے چشمک انجم
آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہ جبیں تھا

اس شعر میں میرؔ اپنے سچے عشقیہ جذبات اور اپنے محبوب کے حسن وجمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے کسی رات چشمک انجم کی طرف نظر نہیں کی، کیوں کہ میرے ذہن ودل پر میرے محبوب کا قبضہ ہے اور میرا ماہ جبیں اس قدر میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے کہ مجھے اس کے علاوہ کسی اور کا نظارہ ہی منظور نہیں ہے۔

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسیں تھا

میرؔ اس شعر میں اپنے محبوب کی بے رخی اور کج ادائی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے، میرا محبوب ایک لمحے کے لیے مجھ سے ملنے آیا تو سہی لیکن بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ جب اس کو میری سچی محبت کا احساس ہوا اور وہ مجھ سے ملنے آیا تو میں نزع کے عالم میں تھا۔

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

اس شعر میں میرؔ محبوب کے ہجر میں اپنی دلی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب سے جدائی کے درد و غم میں میرا جسم و جان رنج و غم میں اس قدر ڈوب گیا ہے کہ میرے تن پہ جس جگہ بھی ہاتھ لگاؤ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارا کرب وہیں سمٹ کر آ گیا ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ اپنے محبوب کی جدائی میں ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔

جانا نہیں کچھ جز غزل آ کر کے جہاں میں
کل میرے تصرف میں یہی قطعۂ زمیں تھا

اس شعر میں میرؔ اپنی غزلیہ شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں مجھے غزل سے بہتر کوئی صنف شاعری نظر نہیں آتی اور کل میرے فکر و خیال کے آئینے میں غزل کے اشعار گشت کر رہے تھے، غزل کی ہی زمینوں پر میری اجارہ داری تھی۔

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا

اس شعر میں میرؔ انسان کی حقیقت اور اس کی زندگی کے عروج و زوال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج ان لوگوں کا کوئی نام تک نہیں لیتا کل جن کی حکمرانی میں پورا ملک تھا اور ان کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا شور چاروں طرف تھا۔ اس شعر میں شاعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کی حقیقت موت ہے اور وہ دنیا میں کتنے ہی ترقیات کے منازل طے کر لے، لیکن ایک دن اسے خالی ہاتھ زمیں دوز ہونا ہی ہے اور اس کے ہم راہ سوائے اعمال کے کچھ نہیں جائے گا۔

مسجد میں امام آج ہوا آکے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

اس شعر میں میرؔ اپنی زندگی کے گذشتہ حالات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج میرؔ مسجد کا امام ہوا ہے لیکن یہ وہی میر ہے جس نے تنگ دستی، بدحالی اور خانہ خرابی کے دن بھی دیکھے ہیں۔ زندگی کی تباہی و بربادی اور غریب الوطنی نے میرؔ کو وہ دن بھی دکھائے ہیں جب وہ خرابات نشیں تھا۔ خوش حالی میں بھی انسان کو اپنی خستہ حالی کے دن نہیں بھولنا چاہیے۔

طلبائے عزیز! امید ہے کہ درج بالا میرؔ کی تینوں غزلوں کے مفاہیم و مطالب سمجھنے کے بعد، اب آپ کو میرؔ کے شعری مزاج اور ان کے فکری رویوں سے کسی حد تک انسیت کا احساس ہو رہا ہوگا، کیوں کہ ان غزلوں کی تشریحات بیان کرنے کا مقصد آپ کے ذہن کو میر کے فکری اور فنی مزاج سے قریب کرنا ہے تاکہ آپ مزید شعری فن پارے کو سمجھنے کے لیے پوری طرح تیار اور آمادہ رہیں۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب میر کی چوتھی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۴)

پائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا — دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا
کاٹے ہیں خاک اڑا کر جوں گرد باد برسوں — گلیوں میں ہم ہوئے ہیں اس بن خراب کیا کیا
انواع جرم میرے پھر بے شمار و بے حد — روز حساب لیں گے مجھ سے حساب کیا کیا
اک آگ لگ رہی ہے سینوں میں کچھ نہ پوچھو — جل جل کے ہم ہوئے ہیں اس بن کباب کیا کیا
افراط شوق میں تو رویت رہی نہ مطلق — کہتے ہیں میرے منہ پر اب شیخ و شاب کیا کیا
پھر پھر گیا ہے آ کر منہ تک جگر ہمارے — گزرے ہیں جان و دل پر یاں اضطراب کیا کیا

کچھ سوجھتا نہیں ہے مستی میں میرؔ جی کو
کرتے ہیں پوچ گوئی پی کر شراب کیا کیا

عزیز طلبا! مذکورہ غزل میرؔ کے دیوان دوم سے مشتق ہے۔ یہ غزل مجموعی طور سے نو اشعار کو محیط ہے، لیکن یہاں محض سات اشعار آپ کے نصاب میں شامل کیے گئے ہیں، جس کے قوافی ''عتاب، عذاب، خراب، حساب، کباب، شاب، اضطراب اور شراب'' ہیں اور ردیف ''کیا کیا'' ہے۔ میر کی یہ غزل بھی سادگی کے پیکر میں معنی و مطالب کا فکری خزانہ ہے۔ غزل کی تشریح و توضیح درج ذیل ہے:

پائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا
دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا

غزل کا مطلع میر کے اس مزاج کا ترجمان ہے جس سے ان کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ میر اس شعر میں راہِ عشق کے نشیب وفراز اور دردوغم کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عشق ومحبت میں رہتے ہوئے میں نے بہت سے القاب پائے اور مجھے محبوب کے غصہ، کج ادائی اور ناراضگی کا سامنا بھی قدم قدم پر کرنا پڑا، جس کی وجہ سے ہم نے بڑے بڑے دردوغم برداشت کیے اور ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی عذاب میں زندگی گزر رہی ہو۔

کاٹے ہیں خاک اڑا کر جوں گردباد برسوں
گلیوں میں ہم ہوئے ہیں اس بن خراب کیا کیا

میرؔ اس شعر میں محبوب کے غمِ ہجر میں خود پر گزرنے والے حالات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے محبوب! تیرے بغیر برسوں سے ہم تیری گلیوں میں ایک آوارہ گرد باد کی طرح پھرتے رہے اور تیری آشفتگی میں خود کو بھی بھول کر تیری گلیوں کا ورد کرتے رہے، جس کی وجہ سے میری زندگی تباہ وبرباد ہوگئی۔

انواع جرم میرے پھر بے شمار و بے حد
روز حساب لیں گے مجھ سے حساب کیا کیا

اس شعر میں میرؔ اپنی ذات وصفات کے آئینے میں انسانی زندگی کے گناہوں کی طرف اشارہ اور خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں میرے کئی طرح کے بے شمار گناہ ہیں، روز حساب مجھ سے میرے کس کس گناہ کا حساب لیا جائے گا۔ اس شعر سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انسان موت وحیات کے درمیان بہت سے گناہوں سے گزرتا ہے اور روز حشر اس کو سبھی کا حساب دینا ہوگا۔

اک آگ لگ رہی ہے سینوں میں کچھ نہ پوچھوں
جل جل کے ہم ہوئے ہیں اس بن کباب کیا کیا

اس شعر میں میرؔ محبوب کے ہجر میں اپنی دلی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کے ہجر میں میرا دل اس قدر جل رہا ہے گویا سینے میں آگ لگ گئی ہو اور اس وقت محبوب کی جدائی میں اس قدر جل جل کر تڑپ رہا ہوں، جس طرح کباب جل بھن کر شکستہ وسیاہی مائل ہوجاتا ہے۔

افراط شوق میں تو رویت رہی نہ مطلق
کہتے ہیں میرے منہ پر اب شیخ و شاب کیا کیا

اس شعر میں میرؔ عشق کی ناکامی اور اپنی بدحالی وخانہ خرابی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشق کی ناکامی اور زمانہ کی کج ادائی نے زندگی میں ایسی بدحالی وخانہ خرابی کے حالات پیدا کردیے ہیں کہ فرطِ شوق کا جذبہ بالکل بھی باقی نہ رہا اور میری اس حالت کو دیکھ کر سب لوگ میرے سامنے دل خراش باتیں اور میرا مذاق بناتے ہیں۔

پھر پھر گیا ہے آ کر منہ تک جگر ہمارے
گزرے ہیں جان و دل پر یاں اضطراب کیا کیا

میر اس شعر میں اپنی زندگی کے تمام نشیب وفراز کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی میں ایسی تنگ دستی، وبدحالی اور خانہ خرابی کا سامنہ کیا ہے کہ کلیجہ منہ کو آگیا اور ان حالات میں میرے جان ودل پر جو اضطراب وبے چینی اور بے سکونی وبے اطمینانی کی کیفیات گزری ہیں ان کا اندازہ میرے سوا کوئی نہیں لگا سکتا۔

کچھ سوجھتا نہیں ہے مستی میں میرؔ جی کو
کرتے ہیں پوچ گوئی پی کر شراب کیا کیا

اس شعر میں میرؔ اپنی مے نوشی اور سرمستی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میں شراب کے نشے میں ہوتا ہوں تو میرے ذہن ودل پر اس قدر مستی کی کیفیت حاوی ہوجاتی ہے کہ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ میں کیا کیا فضول کی باتیں کرنے لگتا ہوں۔اس شعر میں مے نوشی سے مراد شراب عشق ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب شامل نصاب میرؔ کی آخری یعنی پانچویں غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۵)

کیا مصیبت زدہ دل مائل آزار نہ تھا — کون سے درد وستم کا یہ طرف دار نہ تھا
آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ — آئینہ تھا یہ ولے قابل دیدار نہ تھا
دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں — تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا
حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتل ناداں ورنہ — بے گنہ مارنے قابل یہ گنہ گار نہ تھا
عشق کا جذب ہوا باعث سودا ورنہ — یوسف مصر زلیخا کا خریدار نہ تھا
نرم تر موم سے بھی ہم کو کوئی دیتی قضا — سنگ چھاتی کا تو یہ دل ہمیں درکار نہ تھا

رات حیراں ہوں کچھ چپ ہی مجھے لگ گئی میرؔ
درد پنہاں تھے بہت پر لب اظہار نہ تھا

عزیز طلبا! مذکورہ شامل نصاب غزل میرؔ کے دیوان اول سے لی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر آٹھ اشعار کو محیط ہے، لیکن آپ کے نصاب میں اس غزل کے محض سات اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ جس کے قوافی ''آزار، طرف دار، دیدار، دیوار، گنہگار، خریدار، درکار اور اظہار'' ہیں اور ردیف ''نہ تھا'' ہے۔ غزل کی تشریح و توضیح درج ذیل ہے:

کیا مصیبت زدہ دل مائل آزار نہ تھا
کون سے درد و ستم کا یہ طرف دار نہ تھا

اس شعر کی تشریح کچھ اس طرح ہے کہ میر شعر کے ذریعہ آلام و مصائب کے اس تسلسل کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو ان کے دل پر گزرے۔ غم ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے، لیکن میرؔ کا غم اس اعتبار سے مختلف ہے کہ ان کا غم جاودانی ہے یعنی ان کا دل غموں کے تسلسل سے معمور ہے۔ اب تو دل اور غم کے درمیان ایسا اٹوٹ رشتہ قائم ہو گیا ہے کہ وہ داخلی اور خارجی ہر طرح کے غم کو قبول کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر کو آلام و مصائب سے اس قدر انسیت ہو گئی ہے کہ اگر وہ کسی انسان کو کرب میں مبتلا پاتے ہیں تو وہ بھی اس کی تکلیف کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ غم کی وہ ڈور ہے جو ان کو پریشان حال اور غم خوردہ لوگوں سے جوڑتی ہے۔

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ ولے قابل دیدار نہ تھا

اس شعر میں میر تخلیق انسان کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وجودِ انسانی سے پہلے کائنات ایک حقیر سا آئینہ تھی جس میں کوئی تصویر نظر نہ آتی تھی۔ انسان نے ظاہر ہو کر اپنی گونا گوں اور بوقلموں مشغولیات کے ذریعہ طرح طرح کی تصویریں ابھاریں۔ اس طرح یہ آئینہ روشن ہوا اور آباد نظر آنے لگا۔

دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں
تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا

میرؔ اس شعر میں انسان کی بے چارگی، بے سروسامانی اور تنہائی کی تصویر دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنت سے نکالا ہوا انسان دنیا کی مشقت بھری زندگی جی رہا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ غریب الوطنی تھکن کا نام ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میدان جنگ میں پڑی انسانی لاشیں دھوپ میں جل رہی ہیں جس سے معلوم پڑتا ہے کہ ان کو زندگی میں غم دل اور غم دوراں نے چین نہیں لینے دیا تبھی موت کے بعد بھی ان کو سایہ نصیب نہیں ہے، تیسرا مفہوم واقعۂ کربلا سے متعلق ہے، کہ کربلا کے میدان میں شہیدان حق کی لاشیں بے گور و کفن دھوپ میں جلتی ہیں۔ حق بولنے والوں کا انجام ہر دور میں یہی ہوتا ہے کہ انہیں غریب الوطنی بھی ملتی ہے اور شہادت بھی۔

حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتل ناداں ورنہ
بے گنہ مارنے قابل یہ گنہ گار نہ تھا

اس شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ یہ قابل افسوس واقعہ ہے کہ قاتل کی نادانی نے ایک بے گناہ کی جان لے لی جس نے گناہ نہیں کیا تھا۔ میر کا یہ شعر بھی قاری وسامع کو سانحۂ کربلا کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اگر یہ شعر ان کے عہد کے تناظر میں دیکھا جائے تب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرؔ نے خوں ریزی دیکھی اور بے گناہ انسانوں کا قتلِ عام دیکھا اسی ہنگامی حالت کا بیان ہے۔

عشق کا جذب ہوا باعث سودا ورنہ
یوسف مصر زلیخا کا خریدار نہ تھا

میرؔ کہتے ہیں کہ عشق کا جذبہ ہی سودا کا سبب بنا، ورنہ یوسف مصر زلیخا کا خریدار کبھی نہ ہوتا یعنی یوسف زلیخا کو خاطر میں کبھی نہ لاتے اور اگر عشق نہ ہوتا تو زلیخا بھی کبھی دوبارہ جوان نہ ہوتی۔ شعر میں واقعۂ یوسف کو بطور تلمیح پیش کیا گیا ہے۔

نرم تر موم سے بھی ہم کو کوئی دیتی قضا
سنگ چھاتی کا تو یہ دل ہمیں درکار نہ تھا

میرؔ کہتے ہیں کہ دل کا بوجھ اس قدر زیادہ ہے کہ اس کا بار ہم جیسے ناداروں کے لیے اٹھانا بہت مشکل ہے۔ انسان اتنا کمزور ہے کہ اس کو موم سے بھی ہلکے وزن والا دل ملنا چاہیے تھا۔

رات حیراں ہوں کچھ چپ ہی مجھے لگ گئی میرؔ
درد پنہاں تھے بہت پر لب اظہار نہ تھا

میرؔ کہتے ہیں کہ جب انسان کچھ ایسی چیز دیکھ لیتا ہے جس کی وہ توقع نہیں رکھتا، تو وہ حیران وپریشان ہو جاتا ہے تبھی میرؔ فرماتے ہیں کہ رات مجھے حیرانی کی وجہ سے چُپ سی لگ گئی، میرے دل میں اتنے درد چھپے تھے کہ میں ان کا اظہار نہیں کر سکا۔

14.3.2 ماحصل

عزیز طلبا! مذکورہ غزلوں کے متن اور ان کی تفہیم وتوضیح کے مطالعے کے بعد اظہر من الشّمس ہوا کہ میر کا اسلوب سب سے انوکھا اور جدا ہے۔ انہوں نے سخن سرائی کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بعد کے شعرا کے لیے قابل

ستائش اور رہنمائی کا سبب بنا۔ بہ مستعار شخصے ''ان کی شاعری صرف عشق و محبت کی شاعری نہیں، انسان کے مقدر کی شاعری ہے جس کی حیثیت آفاقی ہے۔'' خاصۂ کلام یہ کہ ان کی غزلوں کے الفاظ میں لطیف جذبات کا رسیلا پن پایا جاتا ہے اور فنّی سطح پر وہ اپنے موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کے لہجے اور مزاج کا اثر ہے کہ وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جن میں مٹھاس اور لطافت جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے صنعتوں کا شاندار اور فطری استعمال کیا ہے۔ بالخصوص ان کے تشبیہات و استعارات بہت جان دار ہوتے ہیں۔ وہ استعاروں کا استعمال بڑی ہنرمندی اور فنّی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہوں میں تازگی اور ندرت پائی جاتی ہے۔ وہ غزل کے فن کو اپنے تجربات و مشاہدات میں ڈھالنے کا سلیقہ رکھتے ہیں، جس میں صداقت اور خلوص کی پاکیزگی ہوتی ہے۔ ان کی غزلیں پیکر میں ڈھل کر ایسا تاثر پیدا کرتی ہے کہ قاری فنی اور معنوی دونوں سطحوں سے متاثر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کو کیفیات کی تصویر کشی کا باکمال شاعر تصور کیا جاتا ہے۔

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کی غزلوں کے نمایاں موضوعات مضامین سے واقفیت حاصل کی۔
- میرؔ کے شعری مزاج و آہنگ کا شعور حاصل کیا۔
- میرؔ کی غزلوں کے انفرادی پہلوؤں کا ادراک کیا۔
- میرؔ کی غزلوں کی اہمیت اور معنویت سے آگہی حاصل کی۔
- شامل نصاب غزلوں کی قرأت کی اور اس کی تشریحات سمجھیں۔

14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے:

دل خستہ لوہو جو ہوگیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا کبھو درد وغم سے فگار تھا

۲۔ شاملِ نصاب میرؔ کی دوسری غزل کے مقطع کی وضاحت کیجیے۔

۳۔ میرؔ کی غزلوں کی اہم خصوصیات کو مختصراً تحریر کیجیے۔

۴۔ شامل نصاب غزلوں سے کسی ایک تلمیحی شعر کی نشان دہی کر کے اس کی تشریح کیجیے۔

۵۔ میرؔ کے اس شعر کی نشان دہی کر کے تشریح کیجیے جس میں انھوں نے انسان کے عروج و زوال کے مضمون کو بیان کیا ہے۔

14.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دل جو پریشان تھا بالآخر لہو یعنی خون خون ہو گیا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ کیوں کہ دل کبھی سوز سے داغ ہو جاتا تھا اور کبھی آتش غم میں جلتا رہتا تھا۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ دل اپنے انتہائی جذبے یعنی لہو کی شکل میں بدل گیا، اب اس پر دکھ و درد کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا ہے۔ عزیز طلبا! اس شعر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میرؔ کا غم مایوس کن نہیں بلکہ نشاط بخش ہے۔

۲۔ شامل نصاب دوسری غزل کا مقطع درج ذیل ہے:

اس خوش نگہ کے عشق سے پرہیز کیجو میرؔ
جاتا ہے لے کے جی ہی یہ آزار دیکھنا

میرؔ کہتے ہیں کہ حسینوں کی خوبصورت آنکھیں دیکھ کر ان پر فریفتہ نہ ہو جانا اور ان کے عشق میں مبتلا نہ ہو جانا، کیوں کہ عشق میں جدائی انسان کا دم نکال دیا کرتی ہے۔

۳۔ میر کی غزلوں کی خصوصیات یہ ہے کہ میر بنیادی طور پر واردات قلبیہ کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں داخلی اور خارجی واردات کی دھڑکنیں خلوص، صداقت، سادگی اور سوز و گداز کے ساتھ ملتی ہیں، ان کی غزلوں میں تفکر، سرور، توازن اور ٹھہراؤ بدرجۂ اتم ہے۔ ان کا شیوۂ سخن دنیا کی بے ثباتی، اعلی انسانی اقدار اور اخلاقی معاملات و مسائل کو محیط ہے۔ وہ اپنے موضوعات کو شعری پیکر میں اس خوبصورتی سے تراشتے ہیں کہ تمام حالتوں میں فنّی التزام اور بے تکلفی غالب رہتی ہے۔ طرز سخن میں غنائیت اور موسیقیت اور فنّی دلکشی کا مخصوص دخل ہے۔ ان کی غزلوں کے الفاظ میں لطیف جذبات کا رسیلا پن پایا جاتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں مٹھاس اور لطافت پائی جاتی ہے۔ غزلوں میں صنعتوں کا شاندار اور فطری استعمال ملتا ہے۔ ان کی تشبیہات و استعارات بہت جان دار ہوتی ہیں۔ ان کی تشبیہوں میں تازگی اور ندرت پائی جاتی ہے۔ وہ غزل کے فن کو اپنے تجربات و مشاہدات میں ڈھالنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں پیکر میں ڈھل کر ایسا تاثر پیدا کرتی ہے کہ قاری فنی اور معنوی دونوں سطحوں سے متاثر ہوتا ہے۔

۴۔ تلمیحی شعر درج ذیل ہے:

عشق کا جذب ہوا باعث سودا ورنہ
یوسف مصر زلیخا کا خریدار نہ تھا

میرؔ کہتے ہیں کہ عشق کا جذبہ ہی سودا کا سبب بنا، ورنہ یوسف مصر زلیخا کا خریدار کبھی نہ ہوتا یعنی یوسف زلیخا کو خاطر میں کبھی نہ لاتے اور اگر عشق نہ ہوتا تو زلیخا بھی کبھی دوبارہ جوان نہ ہوتی۔ شعر میں واقعۂ یوسف کو بطور تلمیح پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ انسان کے عروج و زوال کا مضمون میر نے درج ذیل شعر میں پیش کیا ہے:

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا

اس شعر میں میرؔ انسان کی حقیقت اور اس کی زندگی کے عروج و زوال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج ان لوگوں کا کوئی نام تک نہیں لیتا کل جن کی حکمرانی میں پورا ملک تھا اور ان کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا شور چاروں طرف تھا۔ اس شعر میں شاعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کی حقیقت موت ہے اور وہ دنیا میں کتنے ہی ترقیات کے منازل طے کر لے، لیکن ایک دن اسے خالی ہاتھ زمیں دوز ہونا ہی ہے اور اس کے ہم راہ سوائے اعمال کے کچھ نہیں جائے گا۔

14.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
سُلُوک	:	برتاؤ، عمل، رویّہ
زَار	:	مصیبت یا غم کا مارا، مصیبت زدہ، غمگین
دمِ صبح	:	صبح کے وقت
دُود	:	دھواں
پَتنگ	:	پروانہ
خستہ لوہو	:	کمزور
سوز سینہ	:	درد، سینے کی جلن

فِگار	:	عاجز، گھائل، مجروح
ناوَک	:	تیر
مِژہ	:	پلک
خُوں چکاں	:	خون آلود
شِکَستگی	:	ٹوٹ پھوٹ، رنجیدگی، آزردگی، افسردگی، بربادی
خستگی	:	زخمی یا مجروح ہونے کی حالت، شکستگی، شکستہ حالی
شکستہ پا	:	کمزور، ٹوٹا ہوا، چلنے پھرنے سے قاصر، بے بس
چاکِ قفس	:	قفس کی دو تیلیوں کے درمیان کھلی ہوئی خلا کو کہتے ہیں
زِنہار	:	ہرگز، کبھی، خبردار (کلمۂ تنبیہ)
دل غم دیدہ	:	ایسا دل جس نے غم دیکھا ہو، غم میں مبتلا دل
چَشمک	:	آنکھ کا اشارہ، چھیڑ چھاڑ، نظر بازی
بازپسیں	:	آخری، سب سے پیچھے
زیرِ نگیں	:	محکوم، مطیع
خرابات نشیں	:	بری صحبت میں بیٹھنا
گرد باد	:	دھول کا طوفان
رُویَت	:	رونق، آب و تاب، چمک دمک، نظارہ، دیدار
شیخ و شاب	:	بوڑھے اور جوان
پوچ گوئی	:	بکواس، فضول، بیہودہ گفتگو
مائلِ آزار	:	کمزوری، مصیبت، چوٹ یا غصہ کی طرف مائل
وَلے	:	لیکن، مگر، تاہم، بلکہ، سوا، علاوہ
زُلیخا	:	فرعون مصر کی ایک خاص فوج یا محافظوں کے سردار فوطیفار کی بیوی کا نام یہ سردار عزیزِ مصر کے نام سے مشہور ہے، زلیخا حضرت یوسف کو دیکھتے ہی ان پر دل و جان سے عاشق ہوگئی تھی اور جب بازار مصر میں حضرت یوسف کی قیمت لگ رہی تھی تو اس نے انہیں خرید لیا تھا۔

14.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ انتخاب کلام میرؔ : مولوی عبدالحق

۲۔ شعر شور انگیز : شمس الرحمٰن فاروقی

۳۔ میر تقی میرؔ حیات اور شاعری : خواجہ احمد فاروقی

۴۔ بیان میر : احمد محفوظ

۵۔ میر تقی میرؔ : نثار احمد فاروقی

اکائی نمبر 15　میرؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم

ساخت

15.1　اغراض و مقاصد

15.2　تمہید

15.3　میرؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم

15.3.1　منتخب متن کی تدریس و تفہیم

(۱)　میں کون ہوں اے نفساں سوختہ جاں ہوں

(۲)　عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں

(۳)　مشہور ہیں دنوں کی مرے بے قراریاں

(۴)　اب آنکھوں میں خوں دم بہ دم دیکھتے ہیں

(۵)　آ جائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں

15.3.2　ماحصل

15.4　آپ نے کیا سیکھا؟

15.5　اپنا امتحان خود لیجیے

15.6　سوالوں کے جوابات

15.7　فرہنگ

15.8　کتب برائے مطالعہ

15.1　اغراض و مقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میرؔ کی غزلوں کے موضوع و مضامین سے متعارف ہوں گے۔
- میرؔ کی غزلوں کے امتیازات سے واقف ہوں گے۔
- میرؔ کی غزلوں کی لسانی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔
- شامل نصاب پانچ غزلوں کی قرأت اور اس کی تشریح سے مستفید ہوں گے۔
- میرؔ اپنے معاصرین سے کن خصوصیات کی بنا پر ممتاز ہیں؟ سے روشناس ہوں گے۔

15.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میر کی شامل نصاب ردیف ''الف'' کی پانچ غزلوں کی قرأت مع تشریح کی ہے۔ان غزلوں کے مطالعے سے آپ نے میر کے انداز تکلم اور ان کے فکری ابعاد کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ان کے امتیازات شعر سے استفادہ کیا ہے۔اب آپ زیر نظر اکائی کے توسط سے میر کے ردیف ''ن'' کی منتخب پانچ غزلوں کا مع تشریحات مطالعہ کرکے آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ میر نے اپنے اشعار میں کس طرح کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ان کا تخیّل کس طرح نئے نئے مضامین تلاش کرتا ہے اور کس طرح ان مضامین کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے مناسب ترین الفاظ کا انتخاب کیا ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی جانیں گے کہ الفاظ کی مناسب ترتیب سے میر تقی میر نے قاری تک خیالات کی ترسیل میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔الفاظ کی مخصوص بندش سے معانی کے کون سے پہلو زیادہ روشن ہو کر قاری کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔

15.3 میرؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم

15.3.1 منتخب متن کی تدریس و تفہیم

میر کی غزلوں کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اداسی اور غم کی کیفیت کے شاعر ہیں۔ان کے کلام میں مسرت اور خوشی کے جذبات بہت کم بیان ہوئے ہیں۔اب آپ میر کی غزلوں کو پڑھ کر خود رائے قائم کیجیے کہ یہ خیال کتنا درست اور صحیح ہے اور دوسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ میر نے ان غزلوں میں زبان کیسی استعمال کی ہے؟ سہل اور سادہ یا مشکل اور پیچیدہ۔ یہ بھی غور کیجیے کہ ان اشعار میں دلکشی کا سبب کیا ہے؟ یہ اشعار قاری کے دل میں کیوں کر اتر جاتے ہیں اور اس کے ذہن پر دیرپا نقش چھوڑ جاتے ہیں؟

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب پہلی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۱)

میں کون ہوں اے نفساں سوختہ جاں ہوں — اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر — میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لب دریاے سخن پر — صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا — میں باعثِ آشفتگی طبع جہاں ہوں
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبش لب کی — میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیر زباں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہش دل بس کہ پریشاں — درپے نہ ہو، اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم
اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

عزیز طلبا! مذکورہ غزل میرؔ کے دیوان اول میں شامل ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر دس اشعار پر مشتمل ہے لیکن یہاں آپ کے نصاب میں محض سات اشعار منتخب کیے گئے ہیں، جس کے قوافی ''جاں، فشاں، نہاں، رواں، جہاں، زباں، کہاں اور گراں ہیں اور ردیف ''ہوں'' ہے۔اس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

میں کون ہوں اے نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

یہ شعر غزل کا مطلع ہے، مطلع اُس شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ کی پابندی کی گئی ہو، جاں اور فشاں ہم قافیہ الفاظ ہیں اس لیے یہ شعر مطلع کہا جائے گا۔اب شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ پر غور کرتے ہیں۔اس شعر میں تین الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی آپ کو معلوم ہونا چاہیے تبھی آپ پر شعر کے معنی پورے طور پر کھل سکیں گے۔ ہم نفساں، سوختہ جاں اور شعلہ فشاں، ہم نفس، دوست اور ساتھی کو کہتے ہیں۔سوختہ جاں وہ شخص ہے جس کا دل یا جس کی جاں آگ سے جل گئی ہو، اور شعلہ فشاں کے معنی ہیں آگ برسانے والا یعنی جس کی زبان سے الفاظ شعلہ کی مانند گرم اور جلا دینے والے نکلتے ہوں۔ میر نے شعر کے باقی الفاظ روزمرہ استعمال کے ہیں جن کے معنی میں کوئی اشکال نہیں۔

شعر کے پہلے مصرعہ میں دو کردار ہیں ایک تو مخاطب یعنی ہم نفس اور دوسرا کردار شعر کا متکلم ہے۔متکلم اپنے ساتھیوں سے استفہامیہ لہجے میں پوچھتا ہے کہ ''میں کون ہوں''؟ پھر خود ہی وضاحت کرتا ہے کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو اندر ہی اندر اپنے باطن میں کسی آگ کی وجہ سے سلگ رہا ہے۔میرے دل میں ایک آگ روشن ہے، جس کی وجہ سے میرے مُنہ سے شعلے/ انگارے نکلتے ہیں۔ادب کے طالب علم کی حیثیت سے آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ خود غور کریں کہ یہ کون سی آگ ہے جو کہنے والے/ متکلم کے دل میں روشن ہے اور جس کی وجہ سے اس کی زبان سے شعلے نکلتے ہیں جو سُننے والے پر بھی اپنا اثر دکھاتے ہیں۔

تعبیر یہ ہوگی کہ کہیں یہ عشق کی آگ تو نہیں جو شاعر کے دل میں روشن ہے اور شعلہ وہ کلام یا اشعار تو نہیں جو اس کی زبان سے نکلتے ہیں۔دراصل شاعر اپنے اشعار کی گرمی اور دل میں محبت کی آگ کا ہی ذکر کر رہا ہے۔اور اس مفہوم کی تائید روایت سے بھی ہوتی ہے کہ شاعری میں عشق کی کیفت کو آگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

غزل کے اس دوسرے شعر میں ایک مشہور صوفیانہ مضمون باندھا گیا ہے۔اردو شعرا خصوصاً کلاسیکی غزل کے شعرا نے تصوف کے مضامین سے بہت کام لیا ہے اور صوفیانہ خیالات کو نئے نئے پیرایوں میں نظم کیا ہے۔شعر کا کوئی

لفظ مشکل نہیں، بس ''خلوتی رازِ نہاں'' وضاحت طلب ہے۔ خلوتی کے معنی تنہائی اور خلوت میں رہنے والا۔ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ، ''راز نہاں'' ایسے راز کو کہتے ہیں جو دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو۔ اس پوری ترکیب کا مفہوم یہ ہوا۔

ایسا راز جو دنیا والوں کی نظر سے پوشیدہ ہو کر خلوت میں جا چھپا ہو۔ شعر کا مطلب یہ ہوا کہ میرا خود نمائی کا شوق ہی مجھے پردہ سے باہر لایا ہے ورنہ تو میں کسی راز کی طرح خلوت میں پوشیدہ رہنے والا ہوں۔ آپ کو خیال ہوگا کہ اس شعر میں شاعری جیسی کوئی بات یا کوئی نادر خیال نظر نہیں آ رہا ہے۔ دراصل یہ شعر ایک صوفیانہ خیال پر مبنی ہے اور مشہور حدیث کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ایک پوشیدہ خزانے کی طرح تھا لیکن میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں بس میں نے مخلوق پیدا کی تاکہ وہ میری معرفت حاصل کریں۔ آپ میر کے شعر کو پھر ایک بار پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس شعر میں اسی حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور حدیث کے مفہوم کو بنیاد بنا کر شعر کا متن تیار کیا گیا ہے۔ کسی تاریخی یا مذہبی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا یا قرآن و حدیث کی طرف اشارہ کرنا ہی صنعت تلمیح کہلاتا ہے۔

جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

اس شعر میں شاعرانہ تعلّی سے کام لیا گیا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دریائے سخن کے کنارے پر میرے اشعار کی وجہ سے رونق ہے۔ میرے اشعار میں سینکڑوں رنگ کی موجیں نظر آئیں گی۔ میری طبیعت میں دریا کی سی روانی ہے۔ میرے اشعار نہایت روانی سے بہتے چلے جاتے ہیں اور مختلف طرح کی کیفیات اس دریا میں موجوں کی مانند اُبھرتی رہتی ہیں۔ اس شعر کا حُسن رعایت لفظی کے فنکارانہ استعمال سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اب آپ رعایتوں پر غور کریں۔ پہلے مصرعہ میں لب اور سخن میں رعایت موجود ہے کہ کوئی بات لبوں سے ہی کہی جاتی ہے۔ مزید کہ دریا، موج اور رواں میں بھی مناسبت موجود ہے کہ یہ سب ایک ہی معروض یعنی دریا سے متعلق ہیں بس انھیں رعایتوں کی وجہ سے شعری متن فن کے اعتبار سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ شاعر کو رعایتوں کے استعمال کا سلیقہ ہو، رعایتیں اتنی کثرت سے استعمال نہ ہوں کہ خیال یا مضمون پر حاوی ہو کر سطح پر نمایاں ہو جائیں۔

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگی طبع جہاں ہوں

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی مجھ سے مل چکا ہے اور مجھے دیکھ چکا ہے، وہ میرا دیوانہ ہو گیا ہے۔ مجھ سے بار بار

ملنا چاہتا ہے۔ دنیا والوں کی طبیعت میں میری وجہ سے پراگندگی اور پریشانی پیدا ہوگئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شعر کے متکلم/ شاعر کے یہاں ایسی کیا بات ہے جسے دیکھ کر اہل دنیا اس کے دیوانے ہوئے جاتے ہیں۔ بہ ظاہر اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ عشق کے سبب متکلم کا حال اس درجہ خراب ہے کہ ہر دیکھنے والا یہ خراب حال دیکھ کر خود بھی پریشان اور بے چین ہوجاتا ہے۔ یا پھر یہ کہ میر کا کلام سن کر اس کا دیوانہ ہوجاتا ہے کہ سُننے والے کی طبیعت پر بھی ان اشعار کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت بھی پراگندہ اور پریشان ہوجاتی ہے۔ چوں کہ شاعر نے اہل دنیا کی پراگندگی کا سبب بیان نہیں کیا ہے اس لیے شعر میں یک گونہ ابہام پیدا ہوگیا ہے اور اسی ابہام کے سبب شعر کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبش لب کی
میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیر زباں ہوں

مخاطب سے متکلم کہتا ہے کہ مجھے بولنے اور زبان کھولنے کی زحمت مت دو، اگر تم نے اصرار کیا اور بولنے پر مجھے مجبور کیا تو میری زبان میں سیکڑوں باتیں ایسی پوشیدہ ہیں جو خوں میں لتھڑی ہوئی ہیں۔ اگر میں نے کچھ کہا تو تم ان خوں آلودہ باتوں کی تاب نہ لا سکو گے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے خاموش رہنے دو کچھ کہنے یا بولنے پر مجبور نہ کر۔ آغشتہ بخوں کا مطلب: خون میں لتھڑا ہوا ہونا۔ خون آلود ہونا۔

رکھتی ہے مجھے خواہش دل بس کہ پریشاں
درپے نہ ہو، اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

میرے دل میں دبی ہوئی خواہش مجھے پریشان رکھتی ہے۔ اس پریشانی کے عالم میں مجھے خود بھی اپنی خبر نہیں ہوتی بلکہ بے خبری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ میں کہاں ہوں؟ اس لیے میرے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی میرا حال احوال جاننے کی ضرورت ہے۔ شاعر کی دلی خواہش کس بات کی ہے؟ وہ یہ بات نہیں بتاتا بس قاری پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود اندازہ کرے یا قیاس کرے کہ ایسی خواہش کیا ہوسکتی ہے جو کسی کو اس درجہ بے خبر کر دے کہ اُسے یہ احساس بھی باقی نہ رہے کہ وہ خود کس جگہ ہے۔ ''درپے نہ ہو'' کے پیرایہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بار بار اس کی خواہش جاننے کی کوشش کر رہا ہے اور شاعر اُسے بتانے سے قاصر ہے۔

اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم
اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

اس شعر میں دو بیانات کو شاعر نے ایک ساتھ ملا کر پیش کیا ہے۔ ایک بیان تو اپنی ہستی کے بارے میں ہے اور دوسرا محبوب کی نازک مزاجی کا بیان ہے۔ کلاسیکی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ عاشق پر کبھی مہربان

نہیں ہوتا بلکہ سچ پوچھیے تو عاشق کا وجود ہی اُسے گراں گزرتا ہے۔ یہ دونوں بیان عاشق کی زبان سے ادا ہوئے ہیں کہ میرا وجود اور میری ہستی ایک وہم سے زیادہ نہیں یعنی کچھ بھی نہیں۔ ایسے وجود کا بھلا اعتبار ہی کیا؟ لیکن معشوق کو یہ موہوم وجود بھی گوارا نہیں۔ عاشق کا یہ وجود اور معشوق کی نازک مزاجی دونوں ہی دو مصرعوں میں بیان کر دیے گئے ہیں۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب دوسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۲)

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں　　اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
بے کلی دل ہی کی تماشا ہے　　برق میں ایسے اضطراب کہاں
ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ　　ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں
گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں　　مجھ بلانوش کو شراب کہاں
داغ رہنا دل و جگر کا دیکھ　　جلتے ہیں اس طرح کباب کہاں
محو ہیں اس کتابی چہرے کے　　عاشقوں کو سرکتاب کہاں

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

عزیز طلبا! مذکورہ غزل میرؔ کے دیوان دوم سے مشتق ہے۔ یہ غزل مجموعی طور سے نو اشعار کو محیط ہے، لیکن یہاں محض سات اشعار آپ کے نصاب میں شامل کیے گئے ہیں، جس کے قوافی ''تاب، خواب، اضطراب، حجاب، شراب، کباب، کتاب اور خراب ہیں اور ردیف ''کہاں'' ہے۔ غزل کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

مطلع میں سب سے پہلے تو یہ غور کرو کہ ایک بھی فارسی ترکیب استعمال نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے شعر کی زبان عام بول چال سے قریب معلوم ہوتی ہے۔ مفہوم شعر کا یہ ہے کہ عشق ہو جانے کے بعد عاشق کو ایک لمحے کا چین وقرار میسر نہیں ہوسکتا۔ ''آنکھیں لگنا'' محبت ہو جانے کے معنی میں ہے۔ جب اُس محبوب سے آنکھیں لگ گئیں یعنی محبت ہوگئی تو پھر اس کی کسک عاشق کو چین نہیں لینے دیتی، ہمہ وقت محبوب کا خیال اور اس کی یاد ''دن کا چین اور رات کی نیند'' چھین لیتی ہے۔ آنکھ اور خواب کی رعایت لفظی نے شعر کے حُسن کو دوچند کر دیا ہے۔

بے کلی دل ہی کی تماشا ہے
برق میں ایسے اضطراب کہاں

اس شعر میں بھی عاشق کے اضطراب اور بے چینی کو مضمون بنایا گیا ہے اور 'برق' یعنی بجلی کے اضطراب سے عاشق کے دل کی بے چینی کا مقابلہ کر کے برق کے اضطراب کو کم تر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ آسمانی بجلی کا اضطراب اور اس کی تڑپ غیر معمولی ہوتی ہے لیکن عاشق کا اضطراب اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ تماشا ہے یعنی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

یہ شعر اس صوفیانہ تصور کی بنیاد پر بنایا گیا ہے کہ خدا تک پہونچنے میں خود انسان کی ہستی اور اپنے وجود کا احساس حائل ہے۔ اگر انسان اپنی ہستی کو فنا کر دے تو بیچ کے تمام حجابات دور ہو جاتے ہیں اور انسان خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ جب تک آدمی کو اپنی علاحدہ ہستی کا احساس رہتا ہے اور وہ اپنے آپ کو مستقل اور علاحدہ وجود سمجھتا ہے، اُسے خدا تک رسائی حاصل نہیں ہوسکتی۔ انسانی وجود محض ایک دھوکا، اک وہم اور خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس شعر میں یہی خیال نظم ہوا ہے کہ انسان کی اپنی ہستی ہی بیچ کا وہ پردہ ہے جو خالق حقیقی تک پہونچنے نہیں دیتا ''ہم نہ ہوویں'' یعنی اگر اس پردے کو ہم ہٹا دیں اور اپنے وجود کے طلسم کو توڑ ڈالیں تو وجود حقیقی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت درمیان کے سارے حجابات دور ہو جائیں گے۔

گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں
مجھ بلانوش کو شراب کہاں

آنکھوں کی سرخی کے دو اسباب ہو سکتے ہیں اول تو یہ کہ کوئی شخص تمام رات رویا ہو یا پھر اس نے خوب شراب پی ہو۔ شاعر اپنی آنکھوں کی سُرخی کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ میں عشق میں اپنی ناکامیوں کے سبب روتا رہا ہوں اس وجہ سے میری آنکھیں سرخ ہوگئی ہیں۔ یہ دیکھنے والوں کی غلط فہمی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے جی بھر کر تمام رات شراب پی ہے۔ میری قسمت بھلا ایسی کہاں کہ مجھے شراب میسر آئے۔ ''بلانوش'' کا لفظ اپنی محرومی اور بدقسمتی کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ اگر چہ میں بلانوش ہوں کہ جس قدر میسر ہو میں پیتا رہوں گا۔ نہایت بدقسمت ہے وہ شخص جو ''بلانوش'' یعنی کثرت سے شراب پینے والا ہو اور اُسے، شراب کا ایک گھونٹ بھی میسر نہیں۔ یہ محرومی کی انتہا ہے۔ مزید یہ کہ شراب پینا تو درکنار، تمام رات اپنے حالات اور محرومی کے سبب روتے ہی گزرتی ہے۔ یہ دیکھنے والوں کی خوش گمانی بلکہ غلط فہمی ہے کہ وہ میری آنکھوں کی سُرخی کو شراب نوشی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

داغ رہنا دل و جگر کا دیکھ
جلتے ہیں اس طرح کباب کہاں

عاشق کا دل اور اس کا جگر دونوں ہی محبت میں ہمہ وقت جلتے رہتے ہیں اور جلنے کا یہ منظر اور کیفیت انگاروں پر کباب کے جلنے سے بڑھ کر ہے۔ مسلسل سوزش کی وجہ سے دل وجگر دونوں داغوں سے بھر گئے ہیں۔ یہ شعر دیکھنے کے لائق ہے کہ انگاروں پر کباب کے جلنے سے زیادہ دلوں کا داغ دیدنی ہے۔ محبت میں سوزش بھی زیادہ ہے اور دلکشی بھی زیادہ ہے۔

محو ہیں اس کتابی چہرے کے
عاشقوں کو سر کتاب کہاں

عاشقوں کو نصابی کتابوں کو پڑھنے کا بھلا کیوں کر خیال ہوگا۔ وہ تو معشوق کا کتابی چہرہ ہی دیکھتے ہیں اور اس کے پڑھنے میں محو رہتے ہیں۔ ظاہری علوم اور درسی کتاب سے عاشق کو بھلا کیوں کر دلچسپی ہوگی۔ سر کے معنی خیال، فکر اور خواہش کے بھی ہوتے ہیں۔ عاشق کا کہنا ہے کہ معشوق کے کتابی چہرے کے مطالعے میں ڈوبے رہتے ہیں۔

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

اس شعر میں عشق کی کیفیت اور اس کے مطالبات کو نہایت ہنر مندی سے بیان کیا گیا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عشق کے گھر کی رونق اور آبادی بس میر صاحب کے دم سے ہے۔ یہ حوصلہ ہر شخص کو حاصل نہیں کہ وہ عشق کے تقاضوں اور مطالبوں کو پورا کر کے اس کی رونق کو قائم رکھ سکے۔ عشق کے پھلنے پھولنے اور آباد رہنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ تمام ماسوا سے عاشق دست بردار ہو کر بس عشق کا ہو رہے۔ ''خانماں'' کے معنی ہیں گھر بار اور اس کے تمام اسباب، اب بھلا میر صاحب کے علاوہ کون شخص ہے جو اپنا گھر بار مال و اسباب سب کچھ برباد کر کے عشق کا ہو رہے۔ اس لیے جب تک میر صاحب زندہ ہیں عشق کا کاروبار اور اس کی رونق قائم ہے۔ میر کے بعد ان جیسا کوئی دوسرا شخص زمانے میں نہیں جو اپنا گھر بار سب کچھ برباد کرنے کا حوصلہ کر سکے۔ فن کی سطح پر شعر کا حسن صنعت تضاد کے استعمال سے مزید بڑھ گیا ہے۔ آباد اور خراب ایک دوسرے کی ضد ہیں اور یہی صنعت تضاد ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب تیسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۳)

مشہور ہیں دنوں کی مرے بے قراریاں
جاتی ہیں لامکاں کو دل شب کی زاریاں

چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں

سو بار ہم نے گل کے گئے پر چمن کے بیچ
بھر دی ہیں آب چشم سے راتوں کو کیاریاں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدّت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں
جاؤ گے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی باریاں

بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میرؔ
کاٹی تھیں کوہ کن نے بہت راتیں بھاریاں

عزیزطلبا! زیرمطالعہ غزل میرؔ کے دیوان اول سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور سے گیارہ اشعار پر مشتمل ہے لیکن آپ کے مطالعے کے لیے صرف سات شعروں کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس غزل کے قوافی ''قراریاں، زاریاں، دستکاریاں، کیاریاں، ہماریاں، پیاریاں، باریاں اور بھاریاں ہیں۔'' یہ غزل ردیف سے عاری ہے۔ وہ غزل جس میں ردیف کا عدم اہتمام ہو، تو اسے غیر مردف غزل کہتے ہیں۔ اس غزل کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

مشہور ہیں دنوں کی مرے بے قراریاں
جاتی ہیں لامکاں کو دل شب کی زاریاں

سچّے عاشق کا دل ہمہ وقت اضطراب اور بے قراری کی حالت میں ہوتا ہے اور بے قراری کا یہ عالم غیر معمولی ہونے کی وجہ سے مشہور ہو چکا ہے۔ اس بے قراری کی کیفیت یہ ہے کہ جیسے جیسے رات گزرتی ہے اس میں شدّت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور آدھی رات ہوتے ہوتے میرے دل کی آہ وزاری زماں و مکاں کی حدوں سے گزر کر لامکاں تک جا پہونچتی ہے۔ ''دل شب'' فارسی زبان میں آدھی رات کو کہتے ہیں۔ یعنی نصف شب میں میری یہ بے قراری اپنے کمال پر ہوتی ہے اس درجہ کہ لامکاں کی اتھاہ وسعتوں تک رسائی حاصل کر لیتی ہے۔

چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں

غزل کے شعروں کی تفہیم میں صنف کی رسومیات اور روایت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر آپ اس کی روایت سے واقف نہیں ہوں گے تو اشعار کی تفہیم اور تشریح میں دشواری ہوگی۔ اب شعر کی تشریح سے پہلے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہجر میں عاشق کیا کیا کرتا ہے اور اس سے قبل غزلوں میں اُسے کیا کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ عاشق کا ایک عمل تو یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ عشق میں ''دیوانگی'' کی حد تک بے قرار اور بے چین ہوتا ہے اور اسی عالم میں وہ ناخن سے اپنے چہرے پر خراشیں ڈال کر اُسے زخمی کر لیتا ہے۔ بس اسی تصور سے فائدہ اُٹھا کر میر نے شعر کا مضمون بنایا ہے اور اس میں کچھ نئے معنی بھی جوڑے ہیں۔

عاشق کا چہرہ ناخنوں کی خراش سے زخمی ہو چکا ہے، لیکن اس عمل پر وہ نہ تو نادم ہے اور نہ ہی اسے کوئی افسوس ہے۔

میر تو چہرے کے ان زخموں کو نقش و نگار کہتے ہیں اور اسے دلکش دستکاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی عاشق کہتا ہے کہ میرے ہاتھوں نے چہرے پر ناخن کی مدد سے ایسے گل بوٹے بنا دیے ہیں کہ چہرہ اس دست کاری کی وجہ سے اور دلکش اور حسین ہو گیا ہے۔ اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے ان زخموں سے وہ نہ صرف خوش ہے بلکہ اسے اپنی فنکاری اور دست کاری سمجھ کر اس پر ناز اور فخر بھی کرتا ہے۔ کلاسیکی غزل کے عاشق کا یہی منصب ہے کہ وہ عشق میں پیش آنے والی تکلیفوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

سو بار ہم نے گل کے گئے پر چمن کے بیچ
بھر دی ہیں آب چشم سے راتوں کو کیاریاں

بارہا ایسا ہوا ہے کہ معشوق کی جدائی میں میں نے اپنے آنسوؤں سے چمن کی کیاریاں بھر دی ہیں۔ یہ بیان بھی معشوق کے فراق کی کیفیت سے متعلق ہے۔ گل استعارہ ہے معشوق کا، ہجر کے عالم میں رات رات بھر باغوں میں جا کر روتا رہتا ہوں اور اس کثرت سے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے کہ باغ کی کیاریاں میرے آنسوؤں سے بھر گئی ہیں۔ اس شعر میں رعایت لفظی کی وجہ سے حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ گل، چمن، آب اور کیاری ایسے الفاظ ہیں جن کے معانی میں مناسبت ہے کیوں کہ یہ سبھی چمن کے مناسبات ہیں۔ اسی کو صنعت مراعات النظیر کہتے ہیں۔ اس سے شعر کے حُسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مُدّت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

اس شعر میں میر نے اپنے کلام کی قبولیت اور اس کے پُر تاثیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میرا کلام زمانے میں اتنا مقبول ہوگا اور لوگوں میں اس درجہ پسند کیا جائے گا کہ ایک عرصے تک لوگ اس کو گلیوں میں پڑھتے پھریں گے۔ گلی گلی مشہور ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر خاص و عام میں اس قدر پسند کیا جائے گا کہ اس ریختہ یعنی میرے اردو اشعار کو لوگ پسند خاطر ہونے کی وجہ سے پڑھتے پھریں گے۔ ''ان ریختوں'' سے مراد، میر کے اردو اشعار ہیں اور ''باتیں'' سے مراد بھی ان کے اشعار ہیں۔

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

اس شعر میں گل اور معشوق کا مقابلہ کر کے معشوق کو گل پر ترجیح دی گئی ہے۔ پھول بھی دلکش ہے اور اس کی باتیں بھی اچھی ہیں، لیکن معشوق کی باتوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ پھول سے باتیں کر کے وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی جو کہ معشوق کی پیاری پیاری باتوں سے ہوتی تھی۔ ہزار رنگ یعنی ہزار طرح سے، سخن سر کیا یعنی باتیں شروع کیں۔

اس شعر میں بھی آپ غور کریں کہ رنگ اور گل میں مناسبت بالکل سطح پر موجود ہے۔ میر صاحب کی فن کاری اس بات میں ہے کہ صنعتیں کلام میں ایسی گھل مل جاتی ہیں کہ فوراً نظر نہیں پڑتی، لیکن وہ شعر کے حُسن میں نہایت خاموشی سے اضافہ کر دیتی ہیں۔

جاؤ گے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے
گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی باریاں

عشق ومحبت کے قصوں میں قیس وفرہاد کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے۔ان دونوں کرداروں کو عاشقی میں مثالی سمجھا جاتا ہے۔ان کی قربانیاں اور عشق میں حد درجے کو پہونچی ہوئی ان کی دیوانگی کسی دوسرے عاشق کو نصیب نہیں۔ اب میر نے اسی مضمون میں ایک نیا پہلو پیدا کر دیا ہے کہ ان دونوں کی شہرت اس وجہ سے ہے کہ ابھی ہماری باری نہیں آئی ہے۔ جب ہماری باری آئے گی تو میری دیوانگی کے قصّے ان دونوں سے بڑھ کر مشہور ہوں گے۔ابھی مجھ جیسے شکستہ دل کے قصّے کا نمبر نہیں آیا۔ پھر جب ہمارے قصّے لوگوں کو معلوم ہوں گے تو قیس و فرہاد کا نام تک لوگ بھول جائیں گے۔غرض یہ کہ شکستہ دلی میں ہم قیس وفرہاد سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میرؔ
کاٹی تھیں کوہ کن نے بہت راتیں بھاریاں

کوہ کن فرہاد کو کہتے ہیں، کیوں کہ شیریں کو پانے کے لیے اس نے پہاڑ کاٹ ڈالا تھا! شیریں کو پانے کے لیے فرہاد نے یہ مشکل شرط بھی منظور کر لی تھی کہ کوہ بے ستون کو کاٹ ڈالے گا۔لیکن افسوس کہ جب وہ پہاڑ کاٹ کر فارغ ہوا تو شیریں کی موت کی جھوٹی خبر اس تک پہونچی اور اسی رنج کی وجہ سے فرہاد نے اُسی تیشے سے خود کو ہلاک کر لیا جس سے اُس نے پہاڑ کاٹا تھا۔اردو شاعری میں شیریں اور فرہاد کی محبت کے اس قصّے کو مختلف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔کوہ کن فرہاد کا لقب ہے اور چوں کہ شعر میں اسی مشہور قصّے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس لیے اس شعر کو صنعت تلمیح کی مثال کہا جا سکتا ہے۔

مفہوم شعر کا یہ ہے کہ پہاڑ جیسی کئی راتیں فرہاد نے کاٹ ڈالی تھیں، بس ایک رات کی بات اور تھی اگر وہ شیریں کی موت کی خبر پر اعتبار نہ کرتا تو دوسرے روز اُسے حقیقت خود معلوم ہو جاتی اور اس کی جان بچ جاتی۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب چوتھی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۴)

اب آنکھوں میں خوں دم بہ دم دیکھتے ہیں — نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں
ہمیں آ کے اس کے قدم دیکھتے ہیں — جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد

گہے داغ رہتا ہے دل گہہ جگر خوں ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں
اگر جان آنکھوں میں اس بن ہے تو ہم ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں
لکھیں حال کیا اس کو حیرت سے ہم تو گہے کاغذ و گہہ قلم دیکھتے ہیں
وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

کہاں تک بھلا روؤ گے میرؔ صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

عزیز طلبا! آپ کے نصاب میں شامل یہ غزل میرؔ کے دیوان اول سے منتخب کی گئی ہے۔ اس غزل میں کل سات اشعار ہیں جس کے قوافی ''دم، ہم، قدم، ستم، قلم، کم اور ورم'' ہیں اور اس کی ردیف ''دیکھتے ہیں'' ہے۔ غزل کی تشریح و توضیح درج ذیل ملاحظہ کیجیے:

اب آنکھوں میں خوں دم بہ دم دیکھتے ہیں
نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

اس شعر کی بنیاد غزل کی روایت پر قائم ہے۔ عاشق اس درجہ رنج و تکلیف اُٹھاتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ اسی خیال کو شاعر نے آگے بڑھایا ہے کہ میرا عشق اب مرتبۂ کمال کو پہونچ گیا ہے، جس کے نتیجے میں ہر دم آنکھوں سے آنسوؤں کے بجائے خون جاری رہتا ہے۔ اب دوسرے مصرعے میں ''رنگ'' کے لفظ نے معنی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ شاعر اپنے مخاطب سے کہتا ہے کہ مجھے جو خوشی اس حال کو پہونچ کر حاصل ہو رہی ہے وہ نا قابل بیان ہے۔ رنگ کے یوں تو کئی معنی ہیں لیکن اس شعر میں رونق اور خوشی کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ آنکھوں سے ہمہ وقت خوں بہنے کی وجہ سے عجیب رونق پیدا ہو گئی ہے اور دل خوشی سے باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ ''نہ پوچھو'' کے معنی ہیں کہ خوشی کی کیفیت نا قابل بیان ہے۔ اس کے لیے میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو اس منظر کی رونق اور میرے دل کی خوشی کو بیان کر سکیں۔

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد
ہمیں آ کے اس کے قدم دیکھتے ہیں

جیسا کہ گزشتہ اشعار کی تشریح میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ غزل کی روایت میں بہت سے مسلمات ہوتے ہیں جن سے فائدہ اُٹھا کر شاعر نئے نئے مضامین تلاش کرتا ہے اور نئے نئے معانی پیدا کرتا ہے۔ اب اس شعر میں تین کردار موجود ہیں۔ ایک تو عاشق دوسرا معشوق اور تیسرا کردار قاصد کا ہے۔ عاشق نے خط لکھ کر قاصد کو دیا ہے کہ وہ معشوق تک اس کا خط پہونچا دے تا کہ معشوق اس کے حال سے واقف ہو جائے، لیکن معشوق کو اس خط کا جواب لکھنے کی کوئی جلدی نہیں، ادھر عاشق کی بے چینی اور جواب پانے کی جلدی اُسے بے قرار کر رہی ہے۔ اب

عاشق اپنی بے قراری اور بے اختیاری کی وجہ سے قاصد کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میری بے چینی اسی طرح برقرار رہی تو میں خود آ کر معشوق کی قدم بوسی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا اور خط کا جواب پانے تک انتظار کرتے رہنے کے بجائے خود ہی معشوق کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی تسلی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

گہے داغ رہتا ہے دل گہہ جگر خوں
ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں

اس شعر میں بھی عاشق کے ہجر کی کیفیت کا بیان ہے، کہ کبھی تو دل غم فراق کی وجہ سے داغ ہوتا اور کبھی جگر خون ہوا جاتا ہے اور یہ دونوں منظر یعنی دل وجگر کا داغ اور خون ہونا، میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ یہ بھی کیسا ستم اور کیسا ظلم ہے کہ مجھے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔

اگر جان آنکھوں میں اس بن ہے تو ہم
ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں

اس شعر میں یہ خیال باندھا گیا ہے کہ معشوق کو دیکھے بغیر عاشق کا زندہ رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہے، کہا یہ گیا ہے کہ اگر اس کے بغیر آنکھوں میں جان باقی ہے تو بس چند لمحوں کی زندگانی اور ہے، ''کوئی دم'' بہ معنی تھوڑی دیر اور زندگی باقی ہے۔ اولاً تو یہی دشوار ہے کہ اس کے یعنی معشوق کے بغیر آنکھوں میں جان باقی رہے، بالفرض ایسا ہو بھی جاتا ہے تو بس تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتے ہیں، یا تو معشوق کا دیدار میسر ہو جائے گا یا پھر جان ہی جائے گی۔

لکھیں حال کیا اس کو حیرت سے ہم تو
گہے کاغذ و گہہ قلم دیکھتے ہیں

غزل کا بنیادی اسلوب رمزیہ اور اشاراتی ہوتا ہے۔ یعنی شاعر اشاروں میں اپنی بات کہتا ہے جس کی وجہ سے شعر میں ایک خوش گوار ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ میر کے اس شعر میں بھی خوش گوار ابہام موجود ہے اور پڑھنے والا اپنے ذوق اور مطالعے کی روشنی میں اس ابہام کو دور کرتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ متن میں کہا یہ جا رہا ہے کہ میں اپنا حال دل معشوق کو لکھوں بھی تو کیسے لکھوں! ہمارا حال یہ کہ ہے کہ حیرت سے کبھی تو میں کاغذ کو دیکھتا ہوں اور کبھی قلم کو دیکھتا ہوں۔ غرض حالِ دل لکھنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ابہام یہ ہے کہ عاشق کو حیرت کس بات کی ہے؟ کاغذ اور قلم کو حیرت سے دیکھنے کی وجہ کیا ہے؟ پس پڑھنے والا اپنے ذوق اور غزل کی روایت سے واقفیت کی روشنی میں اس ابہام کو دور کرتا ہے اور خود ہی کوئی جواب تلاش کر لیتا ہے۔ حیرت کا ایک سبب تو یہ ممکن ہے کہ خط لکھتے وقت معشوق کی شکل اُسے یاد آ جاتی ہے اور اس کا تصور کر کے وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں خط لکھنا ناممکن ہو جاتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ہمت پر حیرت زدہ ہے کہ معشوق کو خط لکھنے کا حوصلہ اُسے

کیوں کر حاصل ہوا۔ اس کام کے لیے جو ہمت اور حوصلہ درکار ہے وہ عاشق کے پاس نہیں، بس اسی کشمکش میں وہ کبھی تو کاغذ کو دیکھتا ہے اور کبھی قلم کو دیکھتا ہے اور اس سے کچھ بھی لکھا نہیں جاتا۔

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ
اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

محبت میں وفا کرنا اور ثابت قدم رہنا بہت دشوار کن ہے، کیوں کہ محبت کے تقاضے بہت مشکل ہیں، ہر کس و ناکس ان تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ آدمی کو محبت میں اپنی دنیا قربان کرنی پڑتی ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر دیوانگی اختیار کرنی پڑتی ہے اور یہ ایثار ہر شخص نہیں کرسکتا۔ محبت کی تعریف میں سب سے مشہور نام تو قیس یعنی مجنوں کا ہے کہ لیلیٰ کی محبت میں وہ نہ صرف دیوانہ ہوگیا تھا بلکہ اپنا گھر بار چھوڑ کر لیلیٰ کی یاد کو اس نے دن و رات کا مشغلہ بنالیا۔ اب میر صاحب کہتے ہیں کہ قیس تک وفا پیشگی کا سلسلہ کچھ قائم تھا، اب تو یہ حال ہے اس طرح کے لوگ بھی کم ہی کم نظر آتے ہیں۔ لطف شعر کا یہ ہے کہ میر صاحب کے معیار کے مطابق قیس بھی پورا نہیں اترتا، مجنوں نے بس کچھ کچھ ہی محبت کا تقاضا پورا کیا۔ ہمارے زمانے میں تو ایسے لوگ یا اس قسم کے لوگ بھی کم کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بالواسطہ اشارہ یہ ہے کہ ایک میر ہی ہے جو محبت کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرسکتا ہے۔ اسی وجہ سے قیس کو بھی وہ اپنے اعلیٰ معیار پر کچھ کچھ ہی پورا اترتا ہوا دیکھتے ہیں۔

کہاں تک بھلا روؤ گے میرؔ صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

میر تقی میرؔ نے اپنی غزلوں میں رونے کا مضمون مختلف پیرایوں میں باندھا ہے۔ یہاں مقطع میں بھی میر صاحب روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اپنے رونے کا سبب انہوں نے بیان نہیں کیا ہے۔ رونا ہر باشعور اور حساس انسان کا مقدر ہے۔ ہاں اگر انسان بے خبر اور بے حس ہے تو پھر زندگی اس کے لیے سہل ہو جاتی ہے۔ میر نے رونے کی حد کردی ہے، اس لیے وہ خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے میر آخر تو کب تک روتا رہے گا؟ تیرے مسلسل رونے کی وجہ سے اب تو آنکھوں کے گرد سوجن (ورم) بھی نمایاں ہے۔ بس اب تو رونا بند کردے۔ یہ بھی ممکن ہے کوئی دوسرا شخص میر صاحب سے مخاطب ہے اور ان کا حال زار دیکھ کر اظہار ہمدردی کرتے ہوئے رونے سے باز رہنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب پانچویں غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۵)

آ جائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں — مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں
حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں — اُٹھ آسمان تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

مائل بہ غیر ہونا تجھ ابرو کا عیب ہے　　　تھی زور یہ کماں و لے خم چم بہت ہے یاں
اس بت کدے میں معنی کا کس سے کریں سوال　　　آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں
عالم میں لوگ ملنے کے گوں اب نہیں رہے　　　ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں
اعجاز عیسوی سے نہیں بحث عشق میں　　　تیری ہی بات جانِ مجسم بہت ہے یاں

میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمھیں
تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں

عزیز طلبا! مذکورہ شامل نصاب غزل میرؔ کے دیوان اول سے مختص ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر بارہ اشعار پر مشتمل ہے لیکن آپ کے نصاب میں سات شعروں کو منتخب کیا گیا ہے۔ جس کے قوافی ''دم، کم، شبنم، چم، آدم، عالم، مجسم اور غم'' ہیں اور اس کی ردیف ''بہت ہیں یاں'' ہے۔ غزل کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

آ جائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں
مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں

میر تقی میر نے اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا مضمون باندھا ہے کہ دنیا میں آدمی کا قیام بہت مختصر ہے۔ بالکل چنگاری کی مانند کہ بس ایک لمحہ کو چنگاری چمکتی ہے اور پھر پل بھر میں بجھ جاتی ہے۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی نظر آ جائے تو اسی کو بہت سمجھنا چاہیے۔ بسانِ شرر یعنی چنگاری کی مانند دنیا میں قیام کا عرصہ بہت مختصر ہے۔

حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں
اُٹھ آسمان تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

اس شعر میں حیات دنیوی کی لاحاصلی کا بیان ہے کہ زمانے میں سوائے ترائی یعنی آلودگی اور نمی کے کچھ حاصل نہیں۔ ترائی کا علاقہ ان جگہوں کو کہتے ہیں جس کی فضا نمی کے سبب مرطوب ہوتی ہے اور انسان کو کئی آزار اور بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ پہلے مصرعہ میں یہی بات کہی گئی ہے کہ زمانے میں سوائے ترائی کے اور کچھ دھرا نہیں ہے۔ دامن آلودہ ہوگا اور جسمانی صحت بھی جاتی رہے گی، اس لیے بہتر یہی ہے کہ آسمان کے نیچے بیٹھے رہنے کے بجائے اس مرطوب فضا سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن کنایتہً شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ دنیا میں جتنے دن بھی گزارے جائیں گے وہ باعث آزار ہی ہوں گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اور باعثِ آزار اس دنیا کو خدا حافظ کہہ دیا جائے۔ آسمان کے تلے سے اُٹھنے کا مطلب سایۂ آسمان سے نجات حاصل کرنا ہے یعنی دنیا کو خدا حافظ کہنا ہے۔

مائل بہ غیر ہونا تجھ ابرو کا عیب ہے
تھی زور یہ کماں ولے خم چم بہت ہے یاں

اس شعر میں معشوق کے ابرو کی کیفیت کا بیان ہے کہ اس کے ابرو خم دار ہیں جیسے کمان خم دار ہوتی ہے۔ ابرو کی خوبی یہ ہے کہ وہ کمان کی طرح خم دار ہو لیکن اس خوبی کے ساتھ ہی معشوق کے ابرو کا ایک عیب یہ کہ اس میں ناز وادا اور اترانے کی کیفیت بھی ہے۔ بس اسی خم و چم یعنی ناز و ادا کی وجہ سے معشوق کے ابرو کا حسن عاشق کی نظر میں کم ہو گیا ہے۔ اگر حد سے بڑھا ہوا ناز و انداز نہ ہوتا تو معشوق کے ابرو کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ ناز کے سبب معشوق اپنے عاشق کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔

اس بت کدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں

آدمی میں اخلاق اور انسانیت کی جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ دنیا میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ دنیا ایک بت کدہ ہے بے جان اور بے روح، شاعر دنیا کو بت کدے سے تعبیر کر رہا ہے۔ اور بتوں میں محض ظاہری شکل ہوتی ہے معنوی خوبیاں موجود نہیں ہوتیں۔ اس لیے انسان کی حقیقی خوبی کے بارے میں نہ تو کسی سے سوال کرنا ممکن ہے اور نہ ہی اس سوال کا جواب ملنا ممکن ہے۔ چاروں طرف نظر آنے والے افراد آدمی کی صورت تو ضرور رکھتے ہیں لیکن حقیقی معنی میں انھیں آدمی کہنا درست نہیں کیوں کہ آدمیت کے حقیقی جوہر سے سبھی محروم ہیں۔

عالم میں لوگ ملنے کے گوں اب نہیں رہے
ہرچند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

اپنے زمانے کی خرابی کا بیان کرتے ہوئے متکلم کہتا ہے کہ معاشرہ اس درجہ خراب اور بے مروت ہو چکا ہے کہ کوئی شخص اب ملنے کے لائق نہیں رہا۔ گوں کے معنی لائق اور اصل کے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ بھی پوشیدہ ہے گذشتہ زمانے کے لوگ بامروت اور بااخلاق تھے ان میں انسانیت اور شرافت کی رمق باقی تھی۔ اب صورت حال یکسر مختلف ہو چکی ہے۔ اگر ایسا ویسا عالم جو لائق تحسین نہیں ہے آج بھی بہت دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ ایسا ویسا یہاں خرابی کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی ناپسندیدہ عالم تو آج بھی بہت ہے لیکن اس لائق نہیں کہ اس سے ملا جائے یا ربط وضبط بڑھائی جائے۔

اعجاز عیسوی سے نہیں بحث عشق میں
تیری ہی بات جانِ مجسم بہت ہے یاں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے معجزوں کے ساتھ ایک معجزہ یہ بھی عطا کیا تھا کہ وہ قم باذنِ اللہ پڑھ کر دم کرتے تو مردہ بھی زندہ ہو جاتا تھا۔ بس اسی خیال سے فائدہ اُٹھا کر شاعر نے یہ مضمون بنایا ہے کہ عشق کے

بیمار کے لیے شفا کی خاطر حضرت عیسیٰؑ کے دم کرنے کی ضرورت ہی نہیں، معشوق کا عاشق سے فقط بات کر لینا ہی اس کی زندگی اور صحت کے لیے کافی ہے۔ اے جانِ مجسم یعنی معشوق، فقط تیرا عاشق سے بات کر لینا ہی اس کی زندگی کے لیے، بہت کافی ہے۔ اعجاز عیسوی کی تو ضرورت ہی نہیں۔ عشق کا مرض ہی ایسا ہے کہ شفا کے لیے اعجاز عیسوی کی کوئی حاجت نہیں۔

میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمھیں
تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں

اس شعر میں میر تقی میرؔ نے لطیف طنز سے کام لیا ہے اور اسی طنز میں شعر کا لطف پنہاں ہے۔ معشوق نے اپنی جفاؤں سے عاشق کو ہلاک کر دیا ہے اور پھر اپنے اس کیے پر نادم ہے۔ اُسے اس بات کا پچھتاوا ہے کہ بلا وجہ اُس نے عاشق کو قتل کر دیا۔ اب عاشق کہتا ہے کہ تم اپنے کیے کا غم کیوں کر رہے ہو۔ تم خوشی سے اپنی زندگی گزارو، یہاں یعنی دنیا میں اور بہت سے غم ہیں اس معمولی واقعہ پر تمھیں غم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شعر کا پورا لہجہ اور عاشق کا پورا بیان لطیف طنز میں ڈوبا ہوا ہے اور اسی طنز میں شعر کا لطف پوشیدہ ہے۔

15.3.2 ماحصل

مذکورہ غزلوں کے اشعار کی تشریح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ میر تقی میر کی غزلوں کی زبان اگرچہ سادہ اور سہل معلوم ہوتی ہے، لیکن اکثر ایسے الفاظ اور تراکیب بھی نظر آ جاتی ہیں جو شعر میں ابہام یا مشکل پیدا کر دیتی ہیں۔ دوسری خصوصیت ان اشعار کی یہ ہے کہ میر تقی میرؔ نے زیادہ تر دنیا اور دنیوی معاملات کو شاعری میں موضوع بنایا ہے اور کہیں بھی اس مادی دنیا کی تحسین اور تعریف نہیں کی ہے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ عشق و محبت کے مضامین انھوں نے کثرت سے نظم کیے ہیں اور بیشتر عشق کو ایک آزار اور بیماری قرار دیا ہے۔ محبت میں رنج و تکلیف ہی اس محبت کا انجام ہے۔ میر کے کلام میں ایک نوع کی بیزاری اور دل گرفتگی کا عنصر غالب ہے۔ اس لیے میر تقی میر کو نشاط و عیش کا شاعر کہنے کے بجائے مایوسی اور غم کا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ ان اشعار میں عاشق اور معشوق کے اہم کرداروں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ دونوں کردار میر کے کلام میں زیادہ تر کیا کرتے ہیں اور ان کا معمول کیا ہے؟ ان غزلوں کی مدد سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ غزل کی زبان اشاراتی ہوتی ہے۔ شاعر اشاروں میں اور بالواسطہ اپنی بات کہتا ہے اور پڑھنے والوں پر جذبے اور خیال کی کوئی نہ کوئی جہت کُھل جاتی ہے۔ غزل کے اشعار میں تاثر کا اصل سرچشمہ بیان کا اسلوب اور اظہار کا پیرایہ ہوتا ہے کہ کسی خیال کو شاعر نے کس طرح اور کس انداز میں بیان کیا ہے۔ غزل کے اشعار کی بنیاد کسی نہ کسی جذبے اور احساس پر ہوتی ہے جسے میر تقی میر نہایت فن کاری سے الفاظ میں قید کر لیتے ہیں اور پھر اسے مخصوص اسلوب میں کامیابی سے قارئین تک منتقل کر دیتے ہیں۔ میر کے پسندیدہ موضوعات میں دنیا کی بے ثباتی اور عشق کی مختلف کیفیات ہیں اور ان کے کلام میں

رنج و غم کی کیفیات کثرت سے بیان ہوتی ہیں۔

15.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کے پسندیدہ موضوعات و مضامین کو جانا۔
- میرؔ کے فکری اور فنی ترجیحات سے آگہی حاصل کی۔
- میرؔ کے مخصوص اسلوب اور انداز بیان سے واقفیت حاصل کی۔
- میرؔ کی غزلوں کے امتیازی پہلوؤں اور اس کی انفرادیت کو سمجھا۔
- میرؔ کی غزلوں کی تشریحات سمجھیں۔

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ پہلی غزل کے مطلع میں کتنے کردار ہیں اور متکلم اپنے مخاطب سے کیا پوچھتا ہے؟ واضح کیجیے۔

۲۔ درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

هستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

۳۔ میرؔ کے اس شعر کی نشان دہی کیجیے جس میں انھوں نے زخموں کو نقش و نگار سے تعبیر کیا ہے۔

۴۔ درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

کہاں تک بھلا روؤ گے میرؔ صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

۵۔ ''دنیا کی بے ثباتی'' کے حوالے سے میرؔ کے کسی ایک شعر کو مع تشریح تحریر کیجیے۔

15.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ شعر کے پہلے مصرعہ میں دو کردار ہیں ایک تو مخاطب یعنی ہم نفس اور دوسرا کردار شعر کا متکلم ہے۔ متکلم اپنے ساتھیوں سے استفہامیہ لہجے میں پوچھتا ہے کہ ''میں کون ہوں''؟ پھر خود ہی وضاحت کرتا ہے کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو اندر ہی اندر اپنے باطن میں کسی آگ کی وجہ سے سلگ رہا ہے۔ میرے دل میں ایک آگ روشن ہے، جس کی وجہ سے میرے مُنہ سے شعلے/ انگارے نکلتے ہیں۔

۲۔ یہ شعر اس صوفیانہ تصور کی بنیاد پر بنایا گیا ہے کہ خدا تک پہونچنے میں خود انسان کی ہستی اور اپنے وجود کا احساس حائل ہے۔ اگر انسان اپنی ہستی کو فنا کر دے تو بیچ کے تمام حجابات دور ہو جاتے ہیں اور انسان خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ جب تک آدمی کو اپنی علاحدہ ہستی کا احساس رہتا ہے اور وہ اپنے آپ کو مستقل اور علاحدہ وجود سمجھتا ہے، اُسے خدا تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ انسانی وجود محض ایک دھوکا، اک وہم اور خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس شعر میں یہی خیال نظم ہوا ہے کہ انسان کی اپنی ہستی ہی بیچ کا وہ پردہ ہے جو خالق حقیقی تک پہونچنے نہیں دیتا ''ہم نہ ہوویں''، یعنی اگر اس پردے کو ہم ہٹا دیں اور اپنے وجود کے طلسم کو توڑ ڈالیں تو وجود حقیقی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت درمیان کے سارے حجابات دور ہو جائیں گے۔

۳۔ زخموں کو نقش و نگار سے تعبیر کیا گیا میرؔ کا شعر درج ذیل ہے:

چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں

۴۔ میر تقی میرؔ نے اپنی غزلوں میں رونے کا مضمون مختلف پیرایوں میں باندھا ہے۔ یہاں مقطع میں بھی میر صاحب روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اپنے رونے کا سبب انہوں نے بیان نہیں کیا ہے۔ رونا ہر باشعور اور حساس انسان کا مقدر ہے۔ ہاں اگر انسان بے خبر اور بے حس ہے تو پھر زندگی اس کے لیے سہل ہو جاتی ہے۔ میر نے رونے کی حد کر دی ہے، اس لیے وہ خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے میر آخر تو کب تک روتا رہے گا؟ تیرے مسلسل رونے کی وجہ سے اب تو آنکھوں کے گرد سوجن (ورم) بھی نمایاں ہے۔ بس اب تو رونا بند کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کوئی دوسرا شخص میر صاحب سے مخاطب ہے اور ان کا حال زار دیکھ کر اظہار ہمدردی کرتے ہوئے رونے سے باز رہنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

۵۔ دنیا کی بے ثباتی پر مبنی شعر:

آ جائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں
مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں

میر تقی میر نے اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا مضمون باندھا ہے کہ دنیا میں آدمی کا قیام بہت مختصر ہے۔ بالکل چنگاری کی مانند کہ بس ایک لمحہ کو چنگاری چمکتی ہے اور پھر پل بھر میں بجھ جاتی ہے۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی نظر آ جائے تو اسی کو بہت سمجھنا چاہیے۔ بسانِ شرر یعنی چنگاری کی مانند دنیا میں قیام کا عرصہ بہت مختصر ہے۔

15.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
شعلہ فشاں	:	انگارہ برسانے والا، یا جس سے شعلہ نکلتا ہے
نفساں	:	دوست، ساتھی، عزیز
خلوتیٔ رازِ نہاں	:	ایسا راز جو خلوت میں پوشیدہ اور چھپا ہوا ہو
آغشتہ خوں	:	خون میں لتھڑا اور ڈوبا ہوا
آنکھیں لگیں	:	محبت ہو جانا
بلانوش	:	بہت زیادہ (شراب) پینے والا
سرِ کتاب	:	کتاب کی فکر اور خیال
خانما خراب	:	ایسا شخص جس کا گھر بار سب برباد ہو چکا ہو
دل شب	:	آدھی رات
کوہ کن	:	پہاڑ کاٹنے والا، کنایہ ہے فرہاد سے
بسانِ شرر	:	چنگاری کی طرح
خم چم	:	ناز و ادا
اعجاز عیسوی	:	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ کہ وہ مردوں کو حکم الٰہی سے زندہ کر دیتے تھے
شکستہ دل	:	ٹوٹا ہوا دل، غم زدہ دل
اضطراب	:	بے چینی، الجھن

15.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	میر تقی میر حیات اور شاعری	:	خواجہ احمد فاروقی
۲۔	میر کی شعری لسانیات	:	قاضی افضال حسین
۳۔	بیانِ میر	:	احمد محفوظ
۴۔	میر تنقید	:	مرتبہ مظہر احمد
۵۔	پیغمبرانِ سخن	:	علی سردار جعفری
۶۔	دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو (دو جلدیں)	:	مرتبہ ریشما پروین

اکائی نمبر 16 میرؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم

ساخت

16.1 اغراض و مقاصد
16.2 تمہید
16.3 میرؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم
16.3.1 منتخب متن کی تدریس و تفہیم
(۱) دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے
(۲) آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی
(۳) آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے
(۴) ان بلاؤں سے کب رہائی ہے
(۵) فقیرانہ آئے صدا کر چلے
16.3.2 ماحصل
16.4 آپ نے کیا سیکھا؟
16.5 اپنا امتحان خود لیجیے
16.6 سوالوں کے جوابات
16.7 فرہنگ
16.8 کتب برائے مطالعہ

16.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میرؔ کی غزلوں کے موضوع و مضامین سے واقف ہوں گے۔
- میرؔ کے فکری اور فنی جہات سے متعارف ہوں گے۔
- میرؔ کی غزلوں کی خصوصیات سے روشناس ہوں گے۔
- میرؔ کی شعری زبان اور محاسن سے متعارف ہوں گے۔
- شامل نصاب پانچ غزلوں کی قرأت اور اس کی تشریحات سے واقف ہوں گے۔

16.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ نے میر: ردیف ''ن'' کی غزلوں کے متن کو پڑھ کر اس کی تشریح وتوضیح سمجھنے کی کوشش کی۔ دوران مطالعہ میر کے موضوعی، لسانی اور فنی خوبیوں کا تجزیاتی سطح سے فہم وادراک کر کے میر کے نظام شعر، امتیاز شعر اور اختصاص شعر کو جانا۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں ردیف ''ی'' کی پانچ غزلوں کے حوالے سے میر کی غزلوں کی عظمت کی شناخت کریں گے۔ لہٰذا یہاں اولاً نصاب میں شامل ردیف 'ی' کی پانچ غزلوں کا متن اور اس کی تشریح وتفہیم پیش کی جائے گی۔ دوم ماحصل یعنی نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ مزید مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دی جائے گی تا کہ متن کی تفہیم میں آپ کو دقت پیش نہ آئے۔

16.3 میرؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

16.3.1 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

میر کی غزلوں کا بنیادی خاصہ اوران کا تخلیقی وفور حزن وملال، رنج وغم اور حرماں نصیبی پر ہی منحصر ہے اور وہی ان کی پہچان بھی ہے۔ اندورن متن اتر کر معلوم ہوتا ہے کہ میر کے تجربات ومشاہدات بہت عمیق اور مختلف ہیں۔ انسانی جذبات وکیفیات کی مختلف جہتیں ان کی غزلوں میں روشن ہیں۔ جس پرقوت انداز میں انھوں نے زندگی کے حقائق نہایت ہی سادگی و پرکاری کے ساتھ نظم کیے ہیں وہ عدیم النظیر ہیں۔ انھوں نے زندگی کے مختلف النوع تجربات ومشاہدات کو جس خلوص، جذبہ، شدت، سادگی اور تخلیقی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے وہ پُرسوز بھی ہیں اور پُرکار بھی۔ تخلیقیت کی نادرکاری اور سحر طرازی ان کی غزلوں کی اہم صفات ہیں۔ جس کا بخوبی اندازہ آپ ذیل کی شامل نصاب غزلوں سے لگا سکتے ہیں۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب پہلی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(ا)

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے　　ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے

عشق وے خواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ　　اس طرح کے خرج لا حاصل کو دولت چاہیے

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا　　آدمی ہووے کسی پیشہ میں جرأت چاہیے

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن　　سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہیے

عشق میں وصل وجدائی سے نہیں کچھ گفتگو　　قُرب وبُعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے

نازکی کو عشق میں کیا دخل ہے اے بوالہوس　　یاں صعوبت کھینچنے کو جی میں طاقت چاہیے

تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میر صاحب دل سلامت چاہیے

عزیز طلبا! مذکورہ شامل نصاب غزل میرؔ کے دیوان اول سے مختص ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر سات اشعار پر مشتمل ہے، جس کے قوافی ''فرصت، مدت، دولت، جرأت، قدرت، محبت، طاقت اور سلامت'' ہیں اور اس کی ردیف ''چاہیے'' ہے۔ غزل کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے
ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے

دل کو ایک بستی قرار دے کر متکلم کہتا ہے کہ دل ایک معمورے یعنی بستی میں مبدل ہو چکا ہے جو کہ کسی ویرانے سے کم نہیں اور ویرانہ آسانی سے آباد نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے اس کے حال پر چھوڑ دے، اگر اس ویرانہ کو آباد ہونا ہے، تب بھی ایک بڑی مدت درکار ہے۔ عاشق کا کردار ایک طرح سے دل کی بستی کے اجڑنے کے بعد ناامیدی کا شکار ہو چکا ہے۔

عشق و مے خواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ
اس طرح کے خرجِ لاحاصل کو دولت چاہیے

کہتے ہیں کہ عشق کا مرحلہ و معاملہ ہو یا کہ مے خواری کا، ان دونوں سے درویشی یا فقر و مستی کا کوئی علاقہ نہیں۔ یہاں ان دونوں کے لیے بے پناہ دولت کی ضرورت ہے کیوں کہ عشق اور میخواری پر جو دولت لٹائی جاتی ہے اس کا کوئی حاصل نہیں، اسی لیے میر نے اسے 'خرج لاحاصل' سے موسوم کیا ہے۔ حالاں کہ عشق کی معراج قلندری اور فقر و مستی ہی ہے۔

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشہ میں جرأت چاہیے

فرہاد نے عشق میں انتہا کو پہنچ کر اپنی جان گنوادی گویا اس نے ایک طرح سے اپنا فریضہ ادا کیا جو کہ 'عشق' کا مدعا بھی ہوتا ہے۔ اس سے میر نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آدمی چاہے جس کام میں یا پیشے میں ہو، جرأت مندی سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے جیسا کہ فرہاد نے جرأت سے کام لیا۔ غالب نے اس سے بالکل الگ مفہوم پیش کیا کہ کوہکن یعنی فرہاد نے تیشہ کا سہارا لیا، یعنی وہ بھی رسوم و قیود کا پابند تھا:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہیے

یہ شعر بنیادی طور پر تعلّی کا ہے۔ میرؔ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں ہمیں بہت کثرت سے فخر و مباہات اور شاعرانہ عظمت کا بیان ملتا ہے۔ اس شعر میں بھی شاعر نے اپنی قادرالکلامی کو منفرد رنگ سے پیش کیا ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ مجھ جیسے پہلوان شاعر یعنی یکتائے روزگار کا کوئی بھی عاجز سخن شاعر مقابل نہیں ہوسکتا ہے، کیوں کہ سخن میں مقابل بن کر صاحب فن کے سامنے آنے کے لیے لازم ہے کہ طاقت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عاجز سخن میرے سامنے کبھی بھی مقابل بن کر نہیں آتا ہے۔ عاجز سخن اور صاحب فن میں صنعت تضاد ملحوظ ہے۔

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قُرب و بُعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے

اس شعر میں میر نے ایک نظریہ پیش کیا ہے کہ راہ عشق میں وصل اور جدائی دونوں بے معنی ہیں، قریب ہونا یا دور ہونا دونوں ایک جیسے ہیں، مرکزی حیثیت تو 'محبت' کو حاصل ہے۔ ظاہری عشق ہو اور اس میں جذبۂ محبت کا فقدان ہو، تو ایسا عشق کھوکھلا اور بے معنی ہے۔ غالباً حافظ کا یہ شعر میر کے سامنے ہوگا:

در راہِ عشق مرحلۂ قُرب و بُعد نیست
می بینمت عیان و دُعا می فرستمت

یعنی، اصل حیثیت جذبے کی شدت اور صداقت کی ہے۔ یہاں میر نے وصل کی مناسبت سے قُرب اور جدائی کی مناسبت سے بُعد کا استعمال کیا ہے۔

نازکی کو عشق میں کیا دخل ہے اے بوالہوس
یاں صعوبت کھینچنے کو جی میں طاقت چاہیے

اہل ہوس کو مخاطب کر کے متکلم کہتا ہے کہ عشق میں نزاکت سے کام نہیں چلتا۔ اس میں طرح طرح کی صعوبتیں اور پریشانیاں ہوتی ہیں۔ ان صعوبتوں کو برداشت کرنے کا مادہ چاہیے، طاقت چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ راہ عشق آسان نہیں۔ اہل ہوس اور ظاہر پرست عاشق پر طنز بھی ہے۔ اگر غور کیجیے تو میر نے خود کو عشق کے لیے معتبر اور دوسروں کو اور بالخصوص رقیبوں کو ہوس کا پرستار قرار دیا ہے۔

تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میر صاحب! دل سلامت چاہیے

ابھی تو عشق کی ابتدا ہے اور آپ اس قدر تنگ اور پریشان ہونے لگے، خیریت تو ہے؟ میر صاحب! دل کو سلامت اور مضبوط رکھیے، ابھی تو آگے بہت کچھ دیکھنا پڑے گا۔ 'خیریت ہے میر صاحب' جیسے روزمرہ سے اس میں

ارضیت اور برجستگی کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ اس طرح سادگی کے ساتھ پُرکاری کو برقرار رکھنا ہی تخلیقی ہنرمندی ہے۔ راہ عشق کی صعوبتوں سے متنبہ کیا گیا ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب دوسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۲)

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی   دیوانگی کِسو کی بھی زنجیر پا نہ تھی
بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے   ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
کب تھا یہ شور نوحہ ترا عشق جب نہ تھا   دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سرا نہ تھی
آگے بھی تیرے عشق سے کھینچے تھے درد و رنج   لیکن ہماری جان پر ایسی بلا نہ تھی
دیکھے دیار حسن کے میں کارواں بہت   لیکن کِسو کے پاس متاعِ وفا نہ تھی
آئی پری سی پردۂ مینا سے جام تک   آنکھوں میں تیری دختر رز کیا حیا نہ تھی

پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہ ہم کو میرؔ
تن میں ہمارے جان کبھو تھی بھی یا نہ تھی

عزیز طلبا! مذکورہ شامل نصاب غزل میرؔ کے دیوان اول سے مختص ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر نو اشعار پر مشتمل ہے، لیکن یہاں محض سات اشعار آپ کے نصاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ جس کے قوافی ''جا، پا، آشنا، سرا، بلا، وفا، حیا اور یا'' ہیں اور اس کی ردیف ''نہ تھی'' ہے۔ جس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی
دیوانگی کِسو کی بھی زنجیر پا نہ تھی

ہمارے زمانے میں وحشت اور جنون کو جو مقام حاصل ہوا ہے، جو اعتبار ملا ہے وہ اب سے پہلے نہیں تھا۔ اصل دیوانگی وہ ہوتی ہے کہ لوگ دیوانے کو زنجیروں میں جکڑ دیں تاکہ وہ صحرا کی طرف، ویرانے کی طرف نکل نہ جائے۔ میر کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے اپنے جنون اور وحشت کی شدت میں اضافہ کر کے جب خود کو 'زنجیر پا' کرلیا تو گویا دیوانگی کو اس کا اصل مقام مل گیا اور پھر میر تو آشفتہ سری کے لیے سنگ کو ہی مداوا تصور کرتے ہیں۔ تبھی تو کہتے ہیں:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے
ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی

اس شعر میں متکلم کہتا ہے کہ چمن میں ایک طرح کی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ بہار کچھ یوں آ کر چلی گئی جیسے کبھی مجھ سے آشنائی ہی نہ تھی۔ پہلے خزاں رسیدہ چمن میں بھی طبیعت بحال رہتی تھی کہ محبوب اور بہار سے آشنائی رہا کرتی تھی۔

کب تھا یہ شور نوحہ ترا عشق جب نہ تھا
دل تھا ہمارا آگے تو ماتم سرا نہ تھی

جب عشق غالب نہ تھا تو اس قدر آہ وفغاں کا شور نہیں تھا، لیکن اب تو یہ دل ایک ماتم کا گھر سا بن گیا ہے۔ یعنی جب عشق آتا ہے تو دل ماتم خانہ بن جاتا ہے۔ اب جیسے یہ دل ہمارا دل نہیں رہا، اس پر تو عشق قابض ہو گیا ہے۔ آہ وزاری، نوحہ گری اور رونے دھونے والے مضامین میر کے یہاں بھرے پڑے ہیں۔ یہ اشعار بھی ساتھ ساتھ رکھ کے پڑھیے تو ایک الگ ہی تناظر خلق ہو جاتا ہے:

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو کاہے کو ہم سایہ سوتا رہے گا

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے
دل نے صدمے بڑے اٹھائے تھے

آگے بھی تیرے عشق سے کھینچے تھے درد و رنج
لیکن ہماری جان پر ایسی بلا نہ تھی

مذکورہ شعر میں عاشق کہتا ہے کہ اے معشوق ہم نے آگے یعنی پہلے بھی تیرے عشق میں رنج والم اٹھائے تھے، لیکن اس وقت یعنی اس بار جو جان پر بن آئی ہے گویا ایک مصیبت سی نازل ہو گئی ہے جو کہ بلائے جان سے کم نہیں۔ اس شعر میں میر نے شدت عشق کی ایک طرح سے انتہا کا بیان کیا ہے۔ اس نوع کے اشعار میر کے یہاں بہت دیکھنے کو ملتے ہیں۔

دیکھے دیار حسن کے میں کارواں بہت
لیکن کِسو کے پاس متاعِ وفا نہ تھی

اس شعر میں متکلم کہتا ہے کہ دنیا میں ہم نے بہت سے حسن کے کارواں دیکھے ہیں لیکن کسی ایک بھی اہل حسن یعنی کہ محبوب میں 'وفا' جیسی دولت نہیں پائی۔ کلاسیکی شاعری کا یہ امتیاز رہا ہے کہ معشوق ہمیشہ وفا شعاری کے بجائے جفا شعاری سے متصف رہا ہے۔ دراصل اس شعر میں محبوب کے رویے سے ایک طرح کی بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے۔

آئی پری سی پردۂ مینا سے جام تک
آنکھوں میں تیری دخترِ رز کیا حیا نہ تھی

'دخترِ رز' دوسرے مصرعے میں انگور کی بیٹی کے لیے استعمال ہوا ہے، لیکن اصطلاحی معنی شراب کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا متکلم کہتا ہے کہ تو جو پری کی شکل میں پردۂ مینا سے جام تک آ گئی تو کیا درمیان میں کسی طرح کا پردہ حائل نہیں تھا؟ ایک نیا اور اچھوتا مضمون باندھا گیا ہے۔ مینا بڑی صراحی ہو سکتی ہے جس سے جام میں شراب بھری جاتی ہے۔ دختر کی رعایت سے ہی 'پردہ' کا استعمال ہوا ہے۔ یعنی شراب مینا یا صراحی میں تھی جسے جام میں بھرتے ہوئے دونوں کے بیچ بے پردگی ہو گئی۔ نازک سا شعر ہے۔

پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہ ہم کو میر
تن میں ہمارے جان کبھو تھی بھی یا نہ تھی

اے میرؔ، ہمیں اپنی پژمردگی اور بجھی ہوئی حالت دیکھ کر تو اب شبہ سا ہونے لگا ہے کہ کبھی میرے تن بدن میں جان تھی بھی یا نہیں۔ یاس اور ناامیدی کی جھلک بھی آ گئی ہے۔ غزل میں کلاسیکی عاشق کو ہمیشہ ایک لاغر اور نحیف کردار کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ تقریباً اسی نوع کا مضمون غالبؔ نے اپنی ایک غزل کے مطلع میں باندھا ہے:

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب تیسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۳)

آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے — کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے
یہ راہ و روش سروِ گلستاں میں نہ ہوگی — اس قامتِ دلچسپ کا انداز دگر ہے
کیا پھیل پڑی مدتِ ہجراں کو نہ پوچھو — مہ سال ہوا ہم کو گھڑی ایک پہر ہے
شب شور و فغاں کرتے گئی مجھ کو تو اب تو — دم کش ہو ٹک اے مرغِ چمن وقتِ سحر ہے
سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود — اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے
کر کام کِسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا — اے آہ سحر گاہ اگر تجھ میں اثر ہے

ہر بیت میں کیا میرؔ تری باتیں گُتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلکِ گُہر ہے

عزیز طلبا! زیر تشریح غزل میر کے دیوان پنجم سے مختص ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر تیرہ اشعار پر مشتمل ہے، لیکن یہاں محض سات اشعار آپ کے نصاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ جس کے قوافی ''نظر، خبر، دگر، پہر، سحر، ضرر، اثر اور گہر'' ہیں اور اس کی ردیف ''ہے'' ہے۔ جس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے
کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے

متکلم کہتا ہے کہ محبوب کے آنے کی جو خبر ہوئی ہے تو میری آنکھیں منتظر ہوگئی ہیں اور اس انتظار کی بے قراری کو دیکھتے ہوئے میرے کان بھی چوکنّے سے ہوگئے ہیں۔ گویا چھپ کر کان بھی متوجہ ہوگئے ہیں۔ گوش کی نظر ہونا ایک بالکل ہی اچھوتا محاورہ ہے۔ کان تو سنتے ہیں لیکن یہاں اس کی بھی نظر کا ذکر ہوا ہے۔ یہاں شدت انتظار کا عمدہ بیان ہے۔ اس طرح مصرعۂ ثانی میں لفظ 'مگر' شاید کے معنی میں نظم ہوا ہے جو شعر میں مزید حسن کا باعث ہے۔

یہ راہ و روش سروِ گلستاں میں نہ ہوگی
اس قامتِ دلچسپ کا انداز دگر ہے

عاشق کہتا ہے کہ جب میرا محبوب چلتا ہے تو اس کے قامت کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے آگے چمن کے سرو کی چال یا قامت اور اس کی روش اور سڈول ہونا معمولی سا لگنے لگتا ہے۔ یہاں سروِ گلستاں اور محبوب کے قامت دلچسپ کا خوبصورت تقابل ہے۔ میر نے محبوب کے قامت کے لیے 'انداز دگر' کا استعمال کر کے چمن کے سرو پر اسے فوقیت دی ہے۔

کیا پھیل پڑی مدتِ ہجراں کو نہ پوچھو
مہ سال ہوا ہم کو گھڑی ایک پہر ہے

اس شعر میں شاعر کا مدعا یہ ہے کہ اس بار جدائی کی مدت کچھ اس قدر وسیع ہوئی کہ مہینہ سال کی طرح اور ایک لمحہ ایک پہر میں بدل گیا۔ مفہوم یہ ہے کہ ہجر کی گھڑیاں کاٹنا ایک عاشق کے لیے محال اور صبر آزما ہوتا ہے۔ ہجر کی مدت کا پھیل پڑنا یعنی طویل ہوجانا۔ مدت ہجراں کی وسعت کے لیے پھیل پڑنے کا استعمال بھی نیا اور انوکھا ہے۔

شب شور و فغاں کرتے گئی مجھ کو تو اب تو
دم کش ہو ٹک اے مرغِ چمن وقتِ سحر ہے

متکلم کہتا ہے کہ میری پوری رات شور وفغاں اور آہ وزاری میں گزر گئی۔ اب صبح ہونے کو ہے، اب تو اے مرغِ چمن

آرام کرنے دے یعنی اب تو آہ وفریاد کرنا شروع کردے۔صبح کو پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔طنز بھی ہے کہ میں نے پوری رات آہ وفغاں کرتے ہوئے گزاری ہے، اب یہ کام تو شروع کردے۔دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اب مجھے آرام کرنے دے اور تو شور کرنا بند کردے کہ رات بھر کا جاگا ہوا ہوں۔دم کش ہونے کا مطلب سانسوں کو روک لینا بہ معنی خاموش رہنا بھی ہوسکتا ہے۔

سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود
اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تو سوچا تھا کہ محبت کا سودا کرنے میں کچھ فائدہ ہوگا لیکن اس میں تو سراسر جی کا نقصان ہی ہے۔یہاں اگر 'سودا' کو 'جنون' کے طور پر دیکھیے تو معنی مزید واضح ہوجاتا ہے۔نقصان اور ضرر میں بھی مناسبت لفظی ہے۔سود اور ضرر میں صنعت تضاد ہے۔

کر کام کِسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا
اے آہ سحر گاہ اگر تجھ میں اثر ہے

کہا جاتا ہے 'آہِ سحر گاہی' میں بہت اثر ہوتا ہے جو عرش کو چھو لیتی ہے۔لہٰذا، میرؔ کہتے ہیں کہ اگر اس قدر تجھ میں اثر انگیزی ہے تو ذرا کسی (محبوب) کے دل تک پہنچ کر کچھ کام کر جا۔یعنی اس قدر آہ وزاری کا کچھ تو محبوب پر اثر ہو۔آہ سحر گاہ ہو یا سوز دل، میر تقی میر کے یہاں بغیر ان صفات کے شاعری اور فن کاری نہیں اور اگر ہے بھی تو تخلیقی ہنرمندی سے ایسی شاعری کا کوئی علاقہ نہیں۔وہ ایک دوسری جگہ خود کہتے ہیں:

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتار خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

ہر بیت میں کیا میرؔ تری باتیں گُتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلکِ گُہر ہے

میر نے یہاں مقطع میں تعلّی سے کام لیا ہے۔میر کچھ اور سخن سازی کر کہ ہر ایک شعر میں طرح طرح کی قیمتی باتیں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ دیکھنے سے موتیوں کا ہار (سلک گہر) معلوم ہوتا ہے۔خوب شعر ہوا ہے۔موتی سلک یا دھاگے میں گُتھے جاتے ہیں۔یہاں گہر بات کا کنایہ ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب چوتھی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۴)

ان بلاؤں سے کب رہائی ہے　　عشق ہے فقر ہے جدائی ہے
استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں　　عشق نے آگ یہ لگائی ہے
اس صنائع کا اس بدائع کا　　کچھ تعجب نہیں خدائی ہے
نہ تو جذب رسا نہ بخت رسا　　کیونکے کہیے کہ واں رسائی ہے
ایسا چہرے پہ ہے نہوں کا خراش　　جیسے تلوار منہ پہ کھائی ہے
میں نہ آتا تھا باغ میں اس بن　　مجھ کو بلبل پکار لائی ہے

اور کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں
گاہ و بے گہہ غزل سرائی ہے

عزیز طلبا! آپ کے نصاب میں شامل یہ غزل میرؔ کے دیوان پنجم سے لی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر تیرہ اشعار پر مشتمل ہے، لیکن آپ کے نصاب میں اس غزل سے محض سات اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ جس کے قوافی ''رہائی، جدائی، لگائی، خدائی، رسائی، کھائی، لائی اور سرائی'' ہیں اور اس کی ردیف ''ہے'' ہے۔ غزل کی تشریح و توضیح درج ذیل ہے:

ان بلاؤں سے کب رہائی ہے
عشق ہے فقر ہے جدائی ہے

اس شعر میں عشق، فقر اور جدائی کو بلاؤں سے موسوم کیا گیا ہے۔ یعنی جب عشق ہوتا ہے، جنون ہوتا ہے، پھر افلاس اور فقر آتا ہے اور آخر کار محبوب سے جدائی ہوتی ہے۔ گویا عشق کے سبب یہ سب بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ عشق، فقر اور جدائی، ان کی ترتیب بھی لفظی و معنوی لحاظ سے موزوں اور مناسب ہے۔

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

عشق کی آگ اور اس کی گرمی سے ہڈیاں کانپ جاتی ہیں۔ شدتِ عشق اور اس کی تپش کا ذکر کیا گیا ہے۔ عشق کی آگ سے ہڈیاں تک جل جاتی ہیں۔ کانپ کانپ جانے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہڈیاں پہلے ہی کمزور ہو چکی ہیں۔ جب کوئی پتلی اور کمزور لکڑی تیز آگ میں جلتی ہے تو وہ شدتِ تپش سے کانپتی رہتی ہے۔ یہاں استخواں یعنی ہڈیاں کمزور لکڑی کی طرح ہو گئی ہیں اور چوں کہ عشق کی حدت شدید ہے اس لیے جلتے ہوئے یہ ہڈیاں کانپ رہی ہیں۔

اس صنائع کا اس بدائع کا
کچھ تعجب نہیں خدائی ہے

یہاں صنائع اور بدائع محبوب کے حسن اوراس کی دل کشی کے لیے استعمال ہوا ہے۔یعنی میرے محبوب میں جو حسن کا جلوہ ہے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، البتہ اس میں خدا کا کرشمہ نظر آتا ہے۔صنائع اور بدائع کا استعمال شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اس معنی میں کیا ہوگا۔صنائع بدائع سے ہی شاعری کا تخلیقی حسن فزوں تر ہوتا ہے۔ صنعتوں کے استعمال ہی سے تخلیقیت کو پرواز ملتی ہے، حسن شعر نکھرتا ہے، سو، میر نے اپنے محبوب کے حسن کے لیے ان دونوں لفظوں کا برملا اظہار کیا ہے۔

نہ تو جذب رسا نہ بخت رسا
کیونکے کہیے کہ واں رسائی ہے

مدعا یہ ہے کہ محبوب تک رسائی نہیں ہے اور اس کا جو سبب سمجھ میں آرہا ہے وہ یہ ہے کہ نہ تو میرے جذبۂ محبت میں پختگی ہے اور نہ ہی میں مقدر کا دھنی ہوں۔اس شعر میں عاشق کی محرومی کا ذکر ہے۔جذبے اور بخت کی ناپختگی کا بیان ہے۔

ایسا چہرے پہ ہے نہوں کا خراش
جیسے تلوار منہ پہ کھائی ہے

''نہوں کا خراش''، یعنی چہرے پر جو نشان ہے وہ ناخن کا خراش ہے، لیکن دیکھنے سے لگتا ہے جیسے کسی نے منہ پر یعنی چہرے پر تلوار سے وار کیا ہے۔یہاں یہ خراش محبوب کے چہرے پر ہے یا عاشق کے چہرے پر، واضح نہیں ہے۔اغلب ہے کہ عاشق کے چہرے پر محبوب ہی کے ناخن کا خراش ہے۔ناخن کا خراش ایسا معلوم ہونا کہ تلوار سے کیا گیا وار معلوم ہو، اس میں شاعر نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔

میں نہ آتا تھا باغ میں اس بن
مجھ کو بلبل پکار لائی ہے

میں باغ میں جب بھی سیر کو آتا محبوب کے ہمراہ ہی آتا تھا۔آج تو تنہا اس لیے آگیا کہ بلبل نے آواز دی ہے، بلبل کی نغمہ سرائی میں وہ دلکشی ہے کہ میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب محبوب نہیں آیا تو بلبل نے آواز دی کہ آؤ تاکہ مل کے آہ وزاری کرسکیں۔

اور کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں
گاہ و بے گہہ غزل سرائی ہے

میر کہتے ہیں کہ مجھے دوسرا کوئی کام ہی نہیں، ہر وقت غزل سرائی ہی کرتا رہتا ہوں۔ یعنی بس یہی ایک مشغلہ رہ گیا ہے۔ متواتر مشق سخن کرتے رہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر وقت تخلیقی کام کو مشغلہ قرار دینا شاعری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میرؔ کی شامل نصاب پانچویں غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۵)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
بہت آرزو تھی گلی کی تری — سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے
جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی — حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

عزیز طلبا! مذکورہ شامل نصاب غزل میرؔ کے دیوان اول سے مختص ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر چودہ اشعار پر مشتمل ہے، لیکن یہاں آپ کے نصاب میں صرف سات شعروں کو شامل کیا گیا ہے۔ جس کے قوافی ''صدا، دعا، وفا، اٹھا، نہا، ادا، خدا اور کیا'' ہیں اور ردیف ''کر چلے'' ہے۔ جس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ہم اس دنیا میں فقیر کی طرح آئے تھے، آواز لگا کر اب دعا دیتے ہوئے رخصت ہو رہے ہیں کہ تم لوگ خوش وخرم رہو۔ دراصل اس دنیا میں جو بھی آتا ہے وہ ایک دن یہاں سے رخصت بھی ہوتا ہے۔ لیکن میر نے اس مضمون کو جس سلیقے سے باندھا ہے، یہ انہی کا حصہ ہے۔ ''میاں خوش رہو'' پر غور کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ میر کو روزمرہ کو تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ کھپانے اور پیش کرنے پر کیسی قدرت تھی۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

ہم نے کبھی کہا تھا کہ تیرے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اب دیکھ لو کہ ہم نے اپنا وعدہ نبھایا اور اب دنیا چھوڑ کر جا رہے ہیں، جب تو ہی نہیں تو ہمارا جینا مرنا برابر ہے۔ واضح رہے کہ مرحلۂ عشق میں وعدہ ایفا کرنا مشکل تصور کیا

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

جاتا ہے، وہ بھی جب وعدے میں جینے اور مرنے کی بات ہو۔ اگر غور کیجیے تو اس شعر میں ایک عاشق کے جذبۂ صادق اور اس کی شدت کو نہایت ہی سلیقے سے پیش کیا گیا ہے، جیسے کہ دھیمی آنچ ہے جو اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

ایک ایسی قیمتی اور نادر شے جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں اور اگر پتہ ہے بھی تو شاعر تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے۔ اسی چیز کے حصول کی خاطر دنیا کی ہر ایک چیز سے بے رغبتی سی پیدا ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ محبوب شے 'محبوب' کے سوا کیا ہوگی؟ اس غیر متعینہ چیز کے لیے لفظ 'آہ' نے آگہی کے کئی در کھول دیے ہیں۔ لفظ 'چیز' دونوں مصرعوں میں آنے کے باوجود سماعت پر گراں نہیں گزرتا۔

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

عاشق کہتا ہے کہ جب عشق میں جنون بڑھا تو تیری گلی میں جانے کی آرزو شدید ہوئی۔ تیری گلی میں آنا تو ہوا لیکن آرزو دھری کی دھری رہ گئی، بلکہ جگر کا خون ہوا اور واپس ہوئے تو جیسے لہو میں نہائے ہوئے۔ یعنی یا تو محبوب کی نظر التفات سے محرومی ہوئی یا پھر گلی کے اوباش لڑکوں نے سنگ باری کر کے لہولہان کر دیا۔ دونوں صورتوں میں محرومی اور جان کا زیاں ہی ہوا۔

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

اس شعر میں خدا کی بندگی اور انسان پر جو حقِ بندگی ہے، اسے پیش کیا گیا ہے۔ پیشانی ہمیشہ سجدوں میں رہی اور انسان پر جو حق بندگی ہے، اپنی بساط بھر ہم اسے ادا کرتے رہے۔ حالاں کہ غالب نے اس سے ذرا آگے بڑھ کر یہ کہہ دیا:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دونوں مضمون گرچہ الگ الگ ہیں، لیکن دونوں کی تخلیقی ہنرمندی ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتی ہے۔ جبیں سجدہ کرتے کرتے گھِس گئی میر کی انتہائی بندگی یہی ہے، جب کہ غالب کے نزدیک جان دے دینا بھی ایسا ہے جیسے کہ حق ادا نہیں ہوسکا۔

پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

اردو غزل میں محبوب کو کبھی صنم کہا گیا ہے، تو کبھی بت بھی کہا گیا ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ اے بت یعنی اے محبوب! میں نے تیری پرستش اس حد تک کی کہ دیکھنے والوں کی نظر میں تو خدا ہو گیا۔ اس میں محبوب کی عظمت اور ایک عاشق کی شدتِ جنوں کا اظہار ہے۔

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

اس مقطع میں میرؔ نے ایک کشمکش کا اظہار کیا ہے۔ ہم پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں معلوم نہیں انھیں تکمیل تک پہنچا پایا یا نہیں، لہٰذا اگر کوئی ہم سے پوچھ لے کہ دنیا میں تم کس لیے آئے تھے اور کیا کر کے جا رہے ہو تو آخر اس کا جواب کیا ہوگا۔ اس شعر میں احساس ذمہ داری کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں جو خوبی ہے وہ اس کے معصوم استفہامیہ لہجہ میں ہے۔

16.3.2 ماحصل

عزیز طلبا! اس مطالعے کا حاصل کلام یہ ہے کہ میرؔ کے شعری نظام، لفظیاتی ترتیب و تنظیم اور لسانیاتی امتیازات اردو غزل کی روایت میں ممتاز ہیں۔ ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت با محاورہ الفاظ کی معانت سے بیان کو تخلیقی سطح پر اثر انگیز کرنا ہے، جس میں ایک مخصوص فکر بھی ہے اور فن بھی۔ سوز دل کی بات کریں یا جذب دروں کی، سادگی اور اسلوب شعر کی بات ہو یا پھر سب سے بڑھ کر یاس، نا امیدی اور بے ثباتی دنیا کی، ان تمام مضامین کو میر نے پوری تخلیقی ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شامل نصاب غزلوں کے متن اور ان کی تشریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ میر اردو غزل کے ایک نہایت ہی منفرد اور صاحب اسلوب شاعر ہیں۔

16.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کی غزلوں کے موضوعات و مضامین سے واقفیت حاصل کی۔
- میرؔ کے فکری ابعاد اور فنی ہنر مندیوں کا ادراک کیا۔
- میرؔ کے منفرد لب و لہجہ اور لسانی خوبیوں سے آگہی حاصل کی۔
- میرؔ کی غزل گوئی کے امتیازی پہلوؤں کو جانا۔

- شامل نصاب غزلوں کے متن کو مع تشریح سمجھنے کی کوشش کی۔

16.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میرؔ کی غزلوں کے چند نمایاں خوبیوں کی نشان دہی کیجیے۔

۲۔ شامل نصاب پہلی غزل کے مقطع کی تشریح کیجیے۔

۳۔ درج ذیل شعر کا مفہوم بیان کیجیے:

کیا پھیل پڑی مدتِ ہجراں کو نہ پوچھو
مہ سال ہوا ہم کو گھڑی ایک پہر ہے

۴۔ شامل نصاب تیسری غزل سے تعلّی کے شعر کی نشان دہی کر کے تشریح کیجیے۔

۵۔ محبوب کی گلی میں جانے کی آرزو عاشق کو کب پیدا ہوئی اور وہاں اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا؟ وضاحت کیجیے۔

16.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ میر کی غزلوں کا بنیادی خاصہ اور ان کا تخلیقی وفور حزن وملال، رنج وغم اور حرماں نصیبی پر منحصر ہے۔ ان کے تجربات ومشاہدات میں بہت عمق ہے۔ انسانی جذبات وکیفیات کی مختلف جہتیں ان کی غزلوں میں روشن ہیں۔ انھوں نے زندگی کے حقائق نہایت ہی سادگی و پرکاری کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ زندگی کے مختلف النوع تجربات ومشاہدات ان کے خلوص، جذبہ، شدت، سادگی اور تخلیقی فن کاری کے امین ہیں۔ تخلیقیت کی نادرکاری، سحر طرازی، پرسوزی اور پرکاری ان کی غزلوں کی نمایاں صفات ہیں۔

۲۔ شامل نصاب پہلی غزل کے مقطع کی تشریح درج ذیل ہے:

تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میر صاحب! دل سلامت چاہیے

ابھی تو عشق کی ابتدا ہے اور آپ اس قدر تنگ اور پریشان ہونے لگے، خیریت تو ہے؟ میر صاحب! دل کو سلامت اور مضبوط رکھیے، ابھی تو آگے بہت کچھ دیکھنا پڑے گا۔ 'خیریت ہے میر صاحب' جیسے روزمرہ سے اس میں ارضیت اور برجستگی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اس طرح سادگی کے ساتھ پُرکاری کو برقرار رکھنا ہی تخلیقی ہنرمندی ہے۔ راہ عشق کی صعوبتوں سے متنبہ کیا گیا ہے۔

۳۔ اس شعر میں شاعر کا مدعا یہ ہے کہ اس بار جدائی کی مدت کچھ اس قدر وسیع ہوئی کہ مہینہ سال کی طرح اور ایک لمحہ ایک پہر میں بدل گیا۔ مفہوم یہ ہے کہ ہجر کی گھڑیاں کاٹنا ایک عاشق کے لیے محال اور صبر آزما ہوتا ہے۔ ہجر کی مدت کا پھیل پڑنا یعنی طویل ہو جانا۔ مدت ہجراں کی وسعت کے لیے پھیل پڑنے کا استعمال بھی نیا اور انوکھا ہے۔

۴۔ شامل نصاب تیسری غزل کا مقطع تعلّی پر مبنی ہے، جس کی تشریح درج ذیل ہے:

ہر بیت میں کیا میرؔ تری باتیں گُتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلکِ گُہر ہے

میر نے یہاں مقطع میں تعلّی سے کام لیا ہے۔ میر کچھ اور سخن سازی کر کہ ہر ایک شعر میں طرح طرح کی قیمتی باتیں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ دیکھنے سے موتیوں کا ہار (سلک گہر) معلوم ہوتا ہے۔ خوب شعر ہوا ہے۔ موتی سلک یا دھاگے میں گُتھے جاتے ہیں۔ یہاں گہر بات کا کنایہ ہے۔

۵۔ عاشق کا عشق جب جنونی کیفیت اختیار کر گیا تو اس کے اندر محبوب کی گلی میں جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن جب وہ اپنے معشوق کی گلی میں پہنچا تو اس کی آرزو دھری کی دھری رہ گئی، کیوں کہ وہاں اس کے جگر کا خون ہوا اور اس کی گلی سے لہو میں نہا کر باہر نکلا۔ یعنی یا تو محبوب کی نظر التفات سے محرومی ہوئی یا پھر گلی کے اوباش لڑکوں نے سنگ باری کر کے اسے لہولہان کر دیا۔

16.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
معمورہ	:	بستی، قریہ
نہوں	:	ناخون (نہہ کی جمع)
خرجِ لا حاصل	:	خرچ جس کا حاصل نہ ہو
دلبرِ خود کام	:	اپنا کام خود کرنے والا محبوب
دم کَش	:	سانس روکنے کا عمل
آہِ سحر گاہ	:	صبح کو آہ بھرنا
بُعد	:	دوری فاصلہ
بوالہوس	:	لالچی، حریص
زنجیر پا	:	جس کے پاؤں میں بیڑی ہو

سلکِ گہر	:	موتیوں کا ہار
ماتم سرا	:	ماتم کا گھر
استخواں	:	ہڈی
شرمندۂ اثر	:	اثر رکھنے والا
چشمک	:	عینک، آنکھ کا اشارہ، رنجش
دختر رز	:	انگور کی بیٹی مراد شراب
صنائع بدائع	:	آرائش وزیبائش، الفاظ وتراکیب کو خوبصورت انداز میں برتنا
پژمردہ	:	بجھا ہوا، مایوس
جذب رسا	:	پختہ جذبہ
بختِ رسا	:	اچھی قسمت
سیل	:	بہاو، سیلاب

16.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ کلیات میر : مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

۲۔ انتخابِ کلام میر : مولوی عبدالحق

۳۔ نقدِ میر : سید عبداللہ

۴۔ تلاشِ میر : نثار احمد فاروقی

۵۔ میر کی آپ بیتی : مترجم نثار احمد فاروقی

इग्नू जन-जन का विश्वविद्यालय | ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

SOCIAL MEDIA

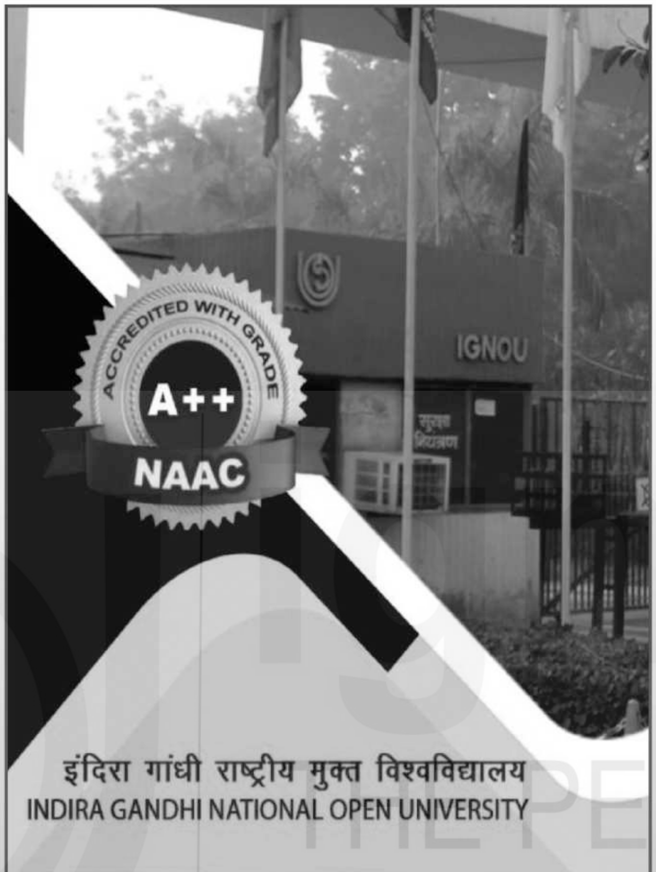

LIVE GYAN DARSHAN | gyandhara | GYAN VANI

YouTube LIVE | LIVE

SWAYAM PRABHA
Free DTH Channel for Education

online_admission | eGyankosh | eContent App | Www.ignou.ac.in

Facebook | Twitter | Instagram

QR Code generated for quick access by Students

IGNOU website
eGyankosh
e-Content APP
Facebook (@officialPageIGNOU)
Twitter (@OfficialIGNOU)
Instagram (officialpageignou)
On line admission

Like us, follow-us on the University Facebook Page, Twitter Handle and Instagram

To get regular updates on Placement Drives, Admissions, Examinations etc.

www.ignou.ac.in

MPDD/IGNOU/P.O. 2.3K/July-2023

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

ISBN : 978-93-5568-850-7